Version No.			

ROLL NUMBER						

⓪ ⓪ ⓪ ⓪ ①①①① ②②②② ③③③③ ④④④④ ⑤⑤⑤⑤ ⑥⑥⑥⑥ ⑦⑦⑦⑦ ⑧⑧⑧⑧ ⑨⑨⑨⑨

Answer Sheet No.____________

Sign. of Candidate___________

Sign. of Invigilator___________

اردو(لازمی) برائے بارھویں جماعت (2nd Set)

ماڈل سوالیہ پرچہ (کریکلم 2006ء)

حصہ اوّل (کل نمبر: 20، وقت: 25 منٹ)

حصہ اول لازمی ہے۔ اس کے جوابات اسی صفحہ پر دے کر ناظم مرکز کے حوالے کریں۔ کاٹ کر دوبارہ لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ **لیڈ پنسل کا استعمال ممنوع ہے۔**

سوال نمبر 1: ہر جزو کے سامنے دیے گئے درست دائرہ کو پر کریں۔

(1) موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چن لیے   قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

علم بیان کی رو سے موتی کو کیا کہیں گے؟

(A) کنایہ ◯ (B) تشبیہ ◯

(C) استعارہ ◯ (D) مجاز مرسل ◯

(2) "قصص الہند" بک۔۔۔۔۔؟

(A) گئے ◯ (B) گیا ◯

(C) گئیں ◯ (D) گئی ◯

(3) درج ذیل میں سے رابطہ کی علامت کی نشاندہی کریں؟

(A) : ◯ (B) " ◯

(C) ؛ ◯ (D) (◯

(4) کسی بات کی حقیقی وجہ کی بجائے کوئی شاعرانہ وجہ بیان کرنا علم بدیع کی رو سے کیا کہلاتا ہے؟

(A) مراعاۃ النظیر ◯ (B) لف و نشر ◯

(C) حسنِ تعلیل ◯ (D) مبالغہ آرائی ◯

(5) بعض اوقات اصل فعل کو اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے کس کی ضرورت ہوتی ہے؟

(A) مرکب جملہ ◯ (B) معاون فعل ◯

(C) مرکب ناقص ◯ (D) فعل حال ◯

(6) زندگی کے عیوب و نقائص اور ماحول کی ناہمواریوں اور خامیوں کو مزاحیہ انداز میں پیش کرنا کہ بُرا بھی نہ لگے کیا کہلاتا ہے؟

(A) تنقید ○ (B) فکاہیہ کالم ○

(C) طنز ○ (D) رپورٹ ○

(7) "زندگی چار دن کی ہے" علم بیان کی رو سے کیا ہے؟

(A) مجاز مرسل ○ (B) کنایہ ○

(C) استعارہ ○ (D) تشبیہ ○

(8) رمز سے کیا مراد ہے؟

(A) ٹھہرنا ○ (B) جانا ○

(C) واضح کرنا ○ (D) اشارہ ○

(9) کسی شخصیت کا ایک مختصر اور ہلکا ادبی تعارف نامہ کیا کہلاتا ہے؟

(A) ادبی مضمون ○ (B) خاکہ ○

(C) سوانح ○ (D) خود نوشت ○

(10) وہ علم جس میں کلام کی خوبیوں پر بحث کی جائے کیا کہلاتا ہے؟

(A) صنائع ○ (B) علم بیان ○

(C) علم بدیع ○ (D) قواعد ○

(11) "میں تمھارے گھر نہیں آسکتا کیونکہ وہ میرے راستے پر نہیں۔" یہ مرکب جملے کی کونسی قسم ہے؟

(A) استدراکی جملہ ○ (B) سببی جملہ ○

(C) وصفی جملہ ○ (D) تمیزی جملہ ○

(12) استعارے کے ارکان میں کیا نہیں ہوتا؟

(A) مستعار لہ ○ (B) مستعار منہ ○

(C) وجہ جامع ○ (D) وجہ شبہ ○

(13) نظامِ برق لیا واپڈا نے جب سے ہاتھوں میں "پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی"

اس شعر میں کس صنعت کا استعمال کیا گیا ہے؟

(A) حسنِ تعلیل ○ (B) تفریق ○

(C) تضمین ○ (D) ایہام ○

(14) "کوئی تیرا خریدار ہے کوئی میرا طلبگار ہے" یہ جملہ نثر کی کونسی قسم ہے؟

(A) مسبجیٰ ○ (B) مرصع ○

(C) سلیس ○ (D) مقفیٰ ○

(15) ایسی نظم جس میں وزن اور بحر کے ساتھ ساتھ قافیہ اور بسا اوقات ردیف کی پابندی کی جائے کیا کہلاتی ہے؟

(A) پابند نظم ○ (B) نظم مصریٰ ○

(C) آزاد نظم ○ (D) سانیٹ ○

(16) "جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

اس مصرعے میں قواعد کی رو سے "جہاں" سے کیا مراد ہے؟

(A) تشبیہ (B) استعادہ ○

(C) مجاز مرسل (D) کنایہ ○

(17) چھ گلاس، دو کپ اور چار پلیٹیں ــــــــــــ فعل اور فاعل کی مطابقت کے حوالے سے درست لفظ کی نشاندہی کریں ؟

(A) ٹوٹ گیئں ◯ (B) ٹوٹ گئی ◯

(C) ٹوٹ گیا ◯ (D) ٹوٹ گئے ◯

(18) "فلائنگ کوچ" وضعی اور مخصوص معنوں کے لحاظ سے کیا ہے؟

(A) استعارہ ◯ (B) مجاز مرسل ◯

(C) سلینگ ◯ (D) تضمین ◯

(19) جب کسی کی توجہ حاصل کرنا مقصود ہو تو کونسی علامت استعمال کی جاتی ہے؟

(A) سکتہ ◯ (B) واوین ◯

(C) ندائیہ ◯ (D) خط ◯

(20) غزل میں موجود آخری مطلع کیا کہلاتا ہے؟

(A) مطلع ثانی ◯ (B) مطلع ثالث ◯

(C) مقطع ◯ (D) حسنِ مطلع ◯

درست جوابات:

(1)	C	(2)	D	(3)	A	(4)	C
(5)	B	(6)	C	(7)	A	(8)	D
(9)	B	(10)	C	(11)	B	(12)	D
(13)	C	(14)	D	(15)	A	(16)	C
(17)	A	(18)	C	(19)	C	(20)	

فیڈرل بورڈ امتحان برائے بارہویں جماعت
اردو (لازمی) ماڈل سوالیہ پرچہ (کریکلم 2006)

وقت: 2:35 گھنٹے | کل نمبر: 80

نوٹ: حصہ دوم اور سوم میں دیے گئے سوالات کے جوابات علیحدہ سے مہیا کی گئی جوابی کاپی پر دیں۔ آپ کے جوابات صاف اور واضح ہونے چاہئیں۔

حصہ دوم (کل نمبر 36)

سوال نمبر 2: (الف) حصہ نثر:

پیراگراف پڑھ کر آخر میں دیے گئے سوالات میں سے پانچ کے جوابات لکھیں: (5x3=15)

پچھواڑے شاہ گنج کی گلی میں دھوبی ٹھلیا اور چمٹا بجا کر کبیرؔ اور تلسیؔ کے دوہے گاتے، تو ہم کان لگا کر نہ سن سکتے کہ ہمارے سامنے ایشیا اور اس کی وسیع چراگاہوں کے نقشے پھیلے ہوئے ہیں پھر پانی پت اور دکن کے میدانوں میں رن پڑے ہوا کرتے اور ہم ایسٹ انڈیا کمپنی، لارڈ کلائیو اور کارنوالس کے ہم قدم تاریخ کی شاہراہ پر چہل قدمی کر رہے ہوتے۔ زندگی میں کونسا موسم ایسا نہیں آتا کہ جب فضا میں جلترنگ نہ بج رہے ہوں، فاختائیں نہ کوکتی ہوں، الغوزوں اور بانسری کی تانیں نہ لہراتی ہوں، مگر امتحان۔ امتحان تو ہمیں اعشاری کسور، سودی نظام اور A+B کے چکر سے نکلنے ہی نہ دیتے۔ وقت اور زمانے سے ہمارے رابطے ٹوٹ رہے تھے البتہ لالُو، لالُو کی بات اور تھی۔ گود کا بچہ سو رہا ہوتا تو خود اس کے نزدیک زندگی کا مقصد نہ رہتا۔ بڑی الکسی سے انگلیاں چٹخاتا اور دانت بھینچ کر گنگنایا کرتا۔

زندگی ہے پیار سے، پیار میں بتائے جا

وہ واقعی زندگی اور دھرتی کے رنگوں سے پیار کرتا، نیلے آسمان اور قوسِ قزح سے رابطہ قائم رکھتا اسے پتا ہوتا، آسمان پر کالی ٹانگوں اور سفید پروں والے بگلوں کی قطار میں آج کتنے بگلے تھے، آنگن میں کتنی لم ڈوریں اور گول آنکھوں والی ڈومن چڑیاں اُتریں۔

سوالات:

i. مصنفہ کبیرؔ اور تلسیؔ کے دوہے کیوں نہیں سن سکیں؟

جواب: مصنفہ کبیرؔ اور تلسیؔ داس کے دوہے نہیں سن سکی تھیں کیونکہ وہ ان دنوں امتحانات کی تیاری میں مصروف تھیں۔ ایشیا اور اس کی چراگاہوں کے نقشے، پانی پت اور دکن کے تاریخی واقعات کو یاد کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔

ii. بقول مصنفہ وہ کس چکر سے نہیں نکل سکیں؟

جواب: مصنفہ ریاضی کے امتحان اور اس ریاضی کے دیگر موضوعات یعنی اعشاری کسور، سودی نظام اور A + B کے چکر سے نکلنے ہی نہ سکتی تھیں۔

iii. تاریخ کی شاہراہ پر مصنفہ کے ہم سفر کون تھے؟

جواب: تاریخ کی شاہراہ پر مصنفہ کے ہم قدم ہونے والوں میں لارڈ کلائیو اور کارنوالس تھے۔ یعنی امتحانات کے سلسلے میں تاریخ کے مضمون کی تیاری ہو رہی تھی۔

iv. مصنفہ کے وقت اور زمانے سے رابطے ٹوٹنے سے کیا مراد ہے؟

جواب: وقت اور زمانے کے رابطے ٹوٹنے سے مراد یہی ہے کہ اپنے کاموں میں مصروف رہنے کی وجہ سے مصنفہ رونما ہونے والے واقعات پہ توجہ نہیں دے پا رہی تھی اور نہ اسے وقت مل پا رہا تھا۔

v. لالو کا زندگی سے تعلق مصنفہ نے کس انداز میں بتایا؟

جواب: لالو کی گود میں ہر وقت اس کا کوئی چھوٹا بہن بھائی سوتا رہتا۔ لالو اس وقت زندگی کے ہر مقصد سے بے گانہ ہو جاتا۔ لیکن اس تمام کے باوجود وہ تحریک پاکستان میں برابر حصّہ لے رہا تھا۔ وہ دھرتی اور دھرتی کے رنگوں سے پیار کرتا تھا۔

جواب vi: بقول مصنفہ زندگی ایک امتحان ہے اور ہر ایک کی اپنی اپنی ترجیحات ہیں۔ کسی کی نظر قریب کی باتوں پہ ہوتی ہے تو کوئی مستقبل کے تقاضوں کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش میں حال کو فراموش کیے ہوتا ہے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق زندگی کا امتحان دینا ہے۔

vii. اس پیراگراف کی تلخیص کریں۔

جواب: پورا ماحول دھرتی کی محبت اور آزادی کے ترانوں سے گونج رہا تھا لیکن مصنفہ تاریخ، جغرافیہ اور ریاضی کے پرچوں کی تیاری میں مصروف تھی۔ لالو کو اپنی دھرتی اور دھرتی کے رنگوں سے پیار تھا اور ارد گرد پر اس کی بھرپور نظر اور خبر ہوتی تھی۔

(ب) **حصہ نظم:**

مندرجہ ذیل اشعار کو پڑھ کر آخر میں دیے گئے سوالات میں سے تین کے جوابات لکھیں: **(3 x3=9)**

یہی عادت ہے روزِ اولیں سے ستاروں کی — چمکتے ہیں کہ دُنیا میں مسرت کی حکومت ہو
چمکتے ہیں کہ انساں فکرِ ہستی کو بُھلا ڈالے — لیے ہے یہ تمنا ہر کرن ان نور پاروں کی
کبھی یہ خاک داں گہوارۂ حسن و لطافت ہو — کبھی انسان اپنی گم شدہ جنت کو پھر پالے

سوالات:

i. ستارے کس انداز میں داستان سناتے ہیں؟

جواب: ستارے اس لیے چمکتے ہیں کہ دنیا میں مسرت کی حکومت ہو۔

ii. "فکر ہستی" کو بھولنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: فکر ہستی کو بھولنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے غم دکھ اور تکالیف میں کمی ہو بلکہ ان کا خاتمہ ہو جائے اور زمین پر امن و آشتی، خوشی اور خوشحالی کا بسیرا ہو۔

iii. خاک داں گہوارہ حسن لطافت کی وضاحت کیجیے۔

جواب: اس زمین کو انسان نے اپنی کوشش سے محنت سے جنت کا نمونہ بنانے کا عزم کیا تھا۔ لیکن انسان ہی نے اسے اپنی کارستانیوں کی وجہ سے مسائل کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ ان تمام حالات کے باوجود دنیا میں امن و امان، اخوت و بھائی چارے کی فضا قائم ہو کر رہے گی۔

iv. جنت کو پھر پانے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

جواب: انسان جس جنت سے زمین پر آیا تھا وہاں کسی قسم کا تعصب، ظلم، زیادتی، ناانصافی نہیں تھا۔ اسی طرح اس زمین کو بھی انسان نے جنت کا نمونہ بنانا تھا جو رواداری، خوش حالی اور اخوت و بھائی چارے کا گہوارہ ہو۔ اور جب یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو گا تو انسان اپنی کھوئی ہوئی جنت کو پالے گا۔

یا

شام کا سورج خود اپنے ہی لہو کی دھاریوں میں ڈوب کر — دیکھتا ہے بجھتی آنکھوں سے سوادِ شہر کے سونے کھنڈر
اس کو لے جائے گی پل بھر میں فنا کے گھاٹ پر — رات کے بحر بسبہ کی موج ہے گرمِ سفر
دیکھتی آنکھوں اُفق کے سرد ساحل پر اندھیرا چھائے گا — ڈوبتا سورج ابھی بھولے دنوں کی داستاں بن جائے گا

سوالات:

i. سورج کیا دیکھتا ہے؟

جواب: سورج بجھتی آنکھوں سے سوادِ شہر کے سُونے کھنڈر دیکھتا ہے۔

ii. فنا کے گھاٹ سے کیا مراد ہے؟

جواب: فنا کے گھاٹ سے مراد یہ ہے کہ ایک خاص وقتِ مقررہ کے بعد سورج نے غروب ہو جانا ہوتا ہے۔ وقت کی خوبصورتی یہی ہے کہ یہ رکتا نہیں اور گزر جاتا ہے اور ہر شے وقت کی گردش میں فنا کی منزل کی جانب گامزن ہے۔

iii. گرمِ سفر کون ہے؟

جواب: رات کے بحرِ سیاہ کی موج گرمِ سفر ہے۔

iv. کون داستان بن جائے گا؟

جواب: ڈوبتا سورج بھی بھولے دنوں کی داستان بن جائے گا یعنی ہر شے فانی ہے اور وقت کے غبار میں گم ہو کر اپنے وجود کو مٹانے کی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔

(ج) حصہ غزل:

درج ذیل اشعار کو پڑھ کر آخر میں دیے گئے سوالات میں سے کوئی سے دو سوالات کے جوابات لکھیں: **(2x3=6)**

i. دل میں پھر اِک کسک سی اُٹھی مدتوں کے بعد — اِک عمر کے رُکے ہوئے آنسو نکل پڑے

ii. وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے — کس گھڑی سر پہ یہ لٹکی ہوئی تلوار گرے

iii. کیسی ویراں ہے گزر گاہِ خیال — جب سے وہ عارض ولب یاد نہیں

سوالات:

i. رکے ہوئے آنسو کیوں نکل پڑے؟

جواب: مدتوں بعد دل میں اک کسک سی اُٹھنے کی وجہ سے اک عمر کے رُکے ہوئے آنسو نکل پڑے۔

ii. "لٹکی ہوئی تلوار" کی وضاحت کیجیے۔

جواب: لٹکی ہوئی تلوار سے مراد یہ ہے کہ انسان ہر لمحہ ہر پل اس اندیشے سے دوچار رہتا ہے کہ اس نے جانے کب اس دنیا سے رخصت ہو جانا ہے۔یعنی موت کا خطرہ ہر گھڑی رہتا ہے۔

iii. تیسرے شعر کا مرکزی خیال لکھیے۔

جواب: جس شخص سے زندگی میں رونق تھی اب وہ نہیں رہا تو خیال تک کی دنیا ویران ہو گئی ہے یعنی محبوب نے بچھڑ کر ساری دنیا ہی ویران کر دی ہے۔

(د) حصہ قواعد:

کوئی سے دو سوالوں کے جوابات لکھیں: **(2 x3=6)**

i. درج ذیل جملوں میں مناسب مقامات پر رموز او قاف لگائیں:

1۔ بہادر نوجوانو اپنے فرائض کب پہچانو گے — 2۔ گلگت سے سکردو تک کا جو سارا پہاڑی علاقہ ہے دشوار گزار ہے

3۔ قائد اعظم نے فرمایا کام کام اور صرف کام

جواب: 1۔ بہادر نوجوانو! اپنے فرائض کب پہچانو گے ؟ 2۔ گلگت سے سکردو تک کا جو سارا پہاڑی علاقہ ہے؛ دشوار گزار ہے۔

3۔ قائد اعظم نے فرمایا "کام، کام اور صرف کام"۔

ii. درج ذیل اشعار میں استعمال ہونے والی صنعتیں تلاش کریں:

۱۔ نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو — یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

۲۔ رشتہ مکرو ریا توڑ بھی دیں، توڑ بھی دیں — کاسۂ حرص وہوا پھوڑ بھی دیں، پھوڑ بھی دیں

۳۔ بے جاں وجاندار کی بنیاد ایک — ارض وسما کی علت ایجاد ایک ہے

جواب: ۱۔ اس شعر میں یدِ بیضا کی صنعت تلمیح استعمال ہوئی ہے

۲۔ اس شعر میں "توڑ بھی دیں توڑ بھی دیں" اور "پھوڑ بھی دیں، پھوڑ بھی دیں" کہ کر صنعتِ تکرار استعمال کی گئی ہے۔

۳۔ بنیاد ایک، ایجاد ایک کہ کر صنعت سیاق اعداد کا ستعمال ہوا ہے اس شعر میں۔

iii. شعر میں صنعت اعداد کی نشاندہی کیجیے:

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے — جتنے اُس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے

جواب: اس شعر میں شاعر نے "دو چار" کی ترکیب استعمال کر کے اعداد استعمال کیے ہیں یعنی کلام کی اس خوبی کو صنعت سیاق اعداد کہتے ہیں۔

حصہ سوم (کل نمبر 44)

سوال نمبر 3: درج ذیل میں سے کسی ایک پیراگراف کی تشریح کریں: (6)

الف۔ ماسٹر صاحب نے ایک رات جوں توں کر کے ٹرانسفامر کے نیچے گزاری اور اگلے دن شیخ کریم نواز کی حویلی پہنچ کر اس سے دو سو روپے اُدھار کے طلب گار ہوئے۔ شیخ صاحب نے ماسٹر صاحب کو نیک دل، سادہ لوح اور مرنجاں مرنج سمجھ کر ٹرخا دیا کیونکہ ایسے احمق لوگوں کو زیادہ رقم دینا اچھا نہیں ہوتا پھر وہ اسماعیل بزاز کی دُکان پر گئے اور رقم میں کمی کر کے ڈیڑھ سو کا سوال کر ڈالا۔ اس نے بھی معذرت کر لی محلے کا کوئی نائی حلوائی قصائی، ڈاکٹر وید، وکیل ماسٹر صاحب نے نہیں چھوڑا لیکن ہر طرف مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان لوگوں کو شدید مہنگائی نے گھیر رکھا تھا اور ان کے پاس اُدھار دینے کو کچھ بھی باقی نہ تھا۔

جواب: تشریح:

ماسٹر الیاس انبالہ سے ہجرت کر کے یہاں آن بسے تھے۔ ماسٹر الیاس دراصل ہمارے بے رحم اور سنگ دل معاشرے کا ایک ایسا کردار ہے جو کسی بھی زاویے اور پہلو سے فِٹ نہیں بیٹھتا۔ لوگوں کو تو اس بات کی خبر نہیں کہ ماسٹر الیاس نے ہجرت کے کن خون آشام مرحلوں کا سامنا کیا تھا، کن مصائب کا شکار ہو کر یہاں تک پہنچا۔ کسی کو اس بات کی قطعاً کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کتنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بچھڑ کر محسن محلہ آیا تھا۔ اس کا کوئی خاص روزگار بھی نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے گزر بسر کر رہا تھا۔ منشی تھا یا کہیں رنگ روغن کا کام کرتا تھا، یہ کسی کو خبر نہ تھی۔ البتہ ہر کوئی یہ ضرور جانتا تھا کہ ماسٹر الیاس، اس زمانے کا آدمی نہیں ہے، بظاہر شکل سے بے کشش انسان، کسی سے گھلتا ملتا بھی نہیں تھا۔ کئی ماہ سے کوٹھڑی کا کرایہ ادا نہ کرنے کے سبب، مالک مکان کا منشی اس کے سر ہو گیا کہ یا تو پورا کرایہ ادا کرو یا پھر کوٹھڑی خالی کر دو۔ وقت مقررہ پر کرایہ ادا نہ کرنے پر اس کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا۔

افسانہ نگار نے اس افسانے میں یہ بات واضح کی ہے کہ ہمارا مزاج اور رویہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ زندوں کو چند سو روپے دینے کے روادار بھی نہیں ہوتے اور مردوں پر سینکڑوں ہزاروں خرچ کرنا سماجی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ کاش ہمیں یہ بات سمجھ آ جائے کہ اصل اہمیت زندہ انسان کی ہوتی ہے۔ ماسٹر الیاس نے بھی مکان کے کرائے کی ادائیگی کے لیے پورے محسن محلہ سے ادھار مانگا لیکن کسی نے اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے قرض کی رقم نہ دی۔ اگرچہ ماسٹر الیاس مزاج کے اعتبار سے تنہائی پسند کردار ہے اور اپنی دنیا میں مگن رہنا ہی پسند کرتا تھا۔

مالک مکان کے منشی نے جب ماسٹر الیاس کا سارا سامان اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دیا تو ماسٹر الیاس نے سردیوں کی ایک رات ٹرانسفارمر تلے گزاری۔ لیکن اگلے دن چارہ سازی اور غم گساری کے لیے شیخ کریم نواز، اسماعیل بزاز الغرض ہر جاننے والے کے سامنے دستِ سوال دراز کیا لیکن کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا اور قرض دینے سے یک سر انکار کر دیا۔

وہی اہلِ محلہ جو ماسٹر الیاس کو قرض دینے کے روادار نہ تھے، بے حسی اور بے مروتی کے پیکر بنے رہے، لیکن جب ماسٹر الیاس شدید جاڑے کی تاب نہ لا کر نمونیے کی وجہ سے فوت ہو گیا تو ان سب کے اندر سوئی ہوئی انسانیت جاگ اٹھی اور کچھ ہی دیر میں کفن دفن کی غرض سے اچھی خاصی رقم اکٹھی ہو گئی اور ہر شخص نے بڑھ چڑھ کر کارِ خیر میں حصہ لینا عین عبادت سمجھا۔ افسانہ نگار یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں مُردوں کی بجائے زندوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ ہمارے معاشرے کا یہ عجب چلن ہے کہ جیتے جی کسی کی قدر نہیں کی جاتی اور نہ ہی اس کی مجبوریوں کا احساس کیا جاتا ہے۔ البتہ مر جانے پر، اعزاز کے ساتھ دفناتے ہیں۔

ب۔ ایک زمانہ تھا جب مشاعروں کے لیے خالص طرحی غزلیں لکھی جاتی تھیں، ہفتوں پہلے اُستاد اپنے شاگردوں کو نکتے سمجھاتے تھے، ان کی زبان صاف کرتے تھے ان کے انداز نکھارتے تھے پھر جب مشاعرے میں آمنے سامنے یہ غزلیں پڑھی جاتی تھیں تو نکتہ وری بے طلب داد دیتی تھی اور فن کاری حوصلہ پا کر نئی بلندیوں تحریک یا تقریب کے محتاج نہیں ہوتے تھے اور نہ کسی آمدنی کا ذریعہ بنتے تھے۔ ان میں وہی لوگ شرکت کرتے تھے جنھیں ذوقِ سخن وہاں کشاں کشاں لے جاتا تھا، قہقہوں، چیخوں اور بد تمیزی کے دیگر مظاہر کو یہاں مطلق دخل نہ تھا۔ مشق شعر اڈرتے ڈرتے شعر پڑھتے اور پختہ کار استاد مصرع اُٹھاتے اُٹھاتے اصلاح دے جاتے۔

جواب: تشریح:

اس پیراگراف میں مصنف نے سنجیدگی سے مشاعروں اور ان کی افادیت کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ برصغیر میں مشاعروں کی روایت اور غزل کا ارتقا ایک ساتھ چلا ہے بلکہ کسی کا یہ قول بہت بار دہرایا جاتا رہا کہ "اردو غزل مشاعرے کی گود میں پلی ہے" اس میں تو شک نہیں کہ مشاعروں میں غزل کا رنگ روپ نکھرا ہے۔ اساتذہ نے اپنے شاگردوں کو مشاعروں میں غزلیں پڑھنے کی ترغیب بھی دی اور ان کی غزلوں کی نوک پلک بھی سنواری ہے۔

فاضل مصنف نے یہ مشاعرے دیکھے اور ان کا کہنا ہے کہ اردو غزل نہ صرف مشاعروں کی گود میں پلی ہے بلکہ ایک عمر بسر کی اور مشاعروں ہی کی وجہ سے اسے عروج نصیب ہوا ہے اور یہ پختگی کی عمر کو پہنچی۔ یہ مشاعروں کا ماحول نہ ہوتا تو یہ سخت جاں ہونے کے باوجود کمزور رہتی۔ غزل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسی صنف سخن ہے جو لاکھ مخالفتوں کے باوجود خصوصاً ترقی پسند تحریک کے ہاں جھٹلائے جانے کے باوجود نہ صرف زندہ رہی بلکہ اردو کے ساتھ یہ بھی ترقی پذیر رہی ہے لیکن اب مشاعروں کا رنگ تفریحی ہو چکا ہے۔ سامعین میں زیادہ تر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو شعر کا ذوق نہیں رکھتے اور سمجھے بغیر داد دیتے ہیں اور رنگ ہوٹنگ کا ہوتا ہے۔

مصنف کو اس بات کا شدید قلق ہے کہ مشاعروں کا محفلیں اجڑ گئیں، رونقیں ماند پڑ گئیں اور مشاعرے بے ذوق اور شعر ناشناس لوگوں کے زیر انتظام مذاق بن کر رہ گئے۔ اب وہ اتنے ارزاں ہو چکے کہ اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھے۔ اب ادبی ذوق کے ختم ہونے پر ان میں بازاری رنگ چوکھا ہو گیا ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ سب کچھ نہایت شرمناک ہے۔

بہت عرصہ پہلے تک مشاعروں کی غرض و غایت اور طریق کار بڑا منظم تھا۔ مشاعرے کا اعلان ہوتا تو اساتذہ اپنے اپنے شاگردوں کی طرحی غزلیں لکھنے کی مشق کراتے ان کے اشعار کی اصلاح کرتے، نوک پلک سنوارتے، زبان صاف کرتے اور پوری تیاری کے بعد انھیں میدان میں اتارتے۔ اب رنگ بدل گیا۔ حمایتی لائے جاتے ہیں۔ گروہ کے گروہ تالیاں بجانے اور داد دینے اور اچھے شعر کہنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے۔ مشاعروں کو آمدنی کا ذریعہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ذوقِ سخن رکھنے والے ہی مشاعروں میں جاتے تھے۔ مشاعروں کو تفریح کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے اور آج کل کا ماحول تفریحی ہی ہوتا ہے حالانکہ یہ تو ادبی ذوق کی تشکین، اسے پروان چڑھانے اور ذہنی نشو و نما کے لیے ہوتے ہیں۔ ایک پریشان کن بات یہ ہے کہ بے ذوق اور بد تمیز سامعین مشاعرہ سننے آجاتے ہیں۔ قہقہے، چیخیں، بے ہنگم شور شرابہ اور بد تمیزی ان کا وطیرہ ہوتا ہے۔ داد کے ڈونگرے غلط اور کم درجے کے شعروں پر برسائے جاتے ہیں۔ یہ سب شعری ذوق نہیں رکھتے اور نہ سخن فہم ہوتے ہیں۔ اس لیے مشاعروں کا اصل مقصد ختم ہو چکا اور تھیٹر کی طرح یہ تفریح کا ذریعہ بن گئے ہیں۔

سوال نمبر4: درج ذیل میں سے کسی ایک نظمیہ جزو کی آسان لفظوں میں تشریح کریں۔ (6)

الف۔ مگر اُونچے ارادے ہیں تو کیا، اُونچے ارادوں کو سمجھنے کا نہیں احساس حاصل سیدھے سادوں کو

جہاں میں سیدھے سادھے آدمی کثرت سے بستے ہیں ہے محدود اُن کی ہمت اور محدود اُن کے رستے ہیں

تمدن اور تہذیبوں نے پھندا اُن پہ ڈالا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہونا ہے وہی جو ہونے والا ہے

جواب: تشریح:

شاعر اس نظم میں اپنی سوچ کی بلند پروازی کا ذکر کرتے ہوئے ان لوگوں کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔ جو حقیقت شناس نہیں اور لکیر کے فقیر ہیں۔ شاعر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہ رہا ہے کہ اگر میرے ارادے بلند ہوں اور میری سوچ پرواز بلند تر ہو تو میں معاشرے میں بڑی تبدیلی نہیں لا سکتا کہ جن لوگوں کے مفاد کے لیے میں سوچتا ہوں اور انھیں موجودہ دور کے تقاضوں کے تخت زندگی میں تبدیلی لانا چاہتا ہوں وہ خود نہیں سوچتے۔

شاعر ایک کشمکش کا شکار ہے۔ ایک ترقی پسند سوچ کے تحت وہ تبدیلیاں چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ قوت کار سے کام لے کر آگے بڑھا جائے مگر جن کے لیے وہ یہ سب کچھ کرنا چاہتا ہے وہ رجعت پسند معاشرے کے لوگ ترقی پسند سوچ نہیں رکھتے اور شاعر اندر ہی اندر کڑھتا رہ جاتا ہے۔ بس اتنا:

اے مرے لب کی تمنا لب خاموش میں آ

انسان کی ترقی اس کی سوچ سے بندھی ہے اگر وہ غور و فکر کرتا ہے، بہتری کے لیے امنگ رکھتا ہے تو تدبر سے اس کو کئی راستے اور نئی راہیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اب وہ ان میں سے قابلِ عمل، زیادہ مفید اور عمدہ کا انتخاب کر لیتا ہے اور زندگی کی راہوں میں آگے بڑھتا ہے۔ شاعر کو گلہ ہے کہ ترقی پسند سوچ رکھنے والے تھوڑے اور لکیر کے فقیروں کی تعداد زیادہ ہے۔ ایسے معاشرے میں کسی تبدیلی اور انقلاب کا تصور ممکن نہیں۔

شاعر کو اس اکثریتی گروہ کے سیدھا سادہ اور اکثریت میں ہونے پر تو کوئی اعتراض نہیں۔ اسے افسوس ہے کہ یہ لوگ کم ہمت ہیں اس لیے کم کوش ہیں۔ نہ وہ سوچیں گے نہ ترقی کی نئی راہیں کھلیں گی۔ وہ پرانی ڈگر پر چلتے رہیں گے۔ شاعر کہتا ہے کہ معمولی سوچ کے لوگ جو تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں ان کی زندگی کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے۔ حالانکہ آگے بڑھنے کی خواہش تو فطرت کا حصہ ہے۔ شاعر ان سے مختلف ہے اور اس کا دکھ واضح ہے:

؎ میرا دکھ یہ ہے کہ میں دوستوں جیسا نہیں میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں

شاعر اس پوری نظم میں عام لوگوں کے رویّے کا شاکی ہے۔ وہ ان کی غیر ترقی پسند سوچ پہ کڑھتا ہے اور بے بسی کا اظہار کرتا ہے۔ اس شعر میں وہ کہ رہا ہے کہ تہذیب و تمدن کا مارا انسان پرانی روش چھوڑ نہیں سکتا۔ اس کی زندگی کے طور طریقے، رہن سہن اور لوگوں کا اجتماعی نظامِ زندگی رجعت پسندانہ ہے اور وہ اس سے باز نہیں آسکتے۔

نئی دنیا کی تعمیر کے لیے زندگی کے نئے انداز بھی اپنانا پڑتے ہیں۔ مگر ان پرانے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہونا تو وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہوا ہے تو پھر تگ و دو، کوشش اور جدوجہد بیکار ہیں۔

عام آدمی کی سوچ کا کیا کہیں غالبؔ جیسا ترقی پسند سوچ رکھنے والا بھی کہتا ہے:

؎ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ب۔ بے جان و جاندار کی بنیاد ایک ہے ارض و سما کی علتِ ایجاد ایک ہے
بُت سینکڑوں ہیں حُسنِ خداداد ایک ہے سب دل الگ الگ ہیں مگر یاد ایک ہے
یکساں ہے مال، گو ہیں دکانیں جُدا جُدا معنی ہیں سب کے ایک زبانیں جُدا جُدا

جواب: تشریح:

دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں بے پناہ رنگا رنگی ہے۔ آٹھ ارب کے لگ بھگ رنگا رنگ انسانوں کے علاوہ کروڑوں کیڑے مکوڑے اور کروڑوں کی تعداد میں آبی مخلوق اور دیگر جانور ہیں اور اسی طرح کروڑوں بے جان اشیاء وجود رکھتی ہیں اور یہ زمین اور یہ آسمان کے پیدا کیے جانے کی وجہ ایک ہی ہے کہ یہ مخلوق انسان کے کام آئے۔ آدم کو اس دھرتی پر اتارا تو اس کے لیے ہواؤں، فضاؤں اور سورج اور دیگر چیزوں کو مسخر کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ خداوند تعالیٰ کی ذات نے پیدا کیا ہے۔۔۔۔ کائنات میں حسنِ فطرت کے سیکڑوں مظاہر ہیں مگر ان کا حسن خداداد ہے۔ انسان اپنے رب کو پکارتا ہے کوئی خدا اور اللہ یا رب یا خالق کہہ کر، کوئی بھگوان کہہ کر۔۔۔۔ مسجد، بت خانہ، مندر اور دیگر عبادت گاہوں میں اسی خدا کی عبادت ہوتی ہے اور سبھی ایک خدا کو یاد کرتے ہیں۔ سب کی طلب بھی ایک اور وہ جو یا بھی ایک ہی کے۔ دکانیں الگ مگر مال ایک سا، نام الگ الگ مگر سب کی یاد ایک خدا کی۔ مطلب ایک ہی ہیں مگر مختلف زبانوں کی وجہ سے نام الگ الگ ہیں۔ اس سے قبل اقبال نے بھی انسانوں کو ایک ہونے کا درس دیا تھا کہ فطرت کا ایک ہی تقاضا ہے:

؎ یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمز مسلمانی اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

اور انسان سے محبت میں نیک و بد کی تمیز ناروا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ انسان کی یوں تو بے شمار قسمیں ہیں۔ جانور، آدمی، فرشتہ خدا آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں۔ کوئی علم کا نور بکھیر رہا ہے اور کوئی ظلم کے اندھیرے عام کر رہا ہے مگر ہیں دونوں ہی انسان اور ایک آدم کی اولاد۔ کوئی انسانیت کا دوست اور کوئی دشمن مگر آدمی ہی تو ہیں۔ آپ زندگی سے دور ہوں یا موت سے بچنے کی کوشش میں دور رہیں مگر انسان سے نفرت جائز نہیں۔ اس سے نفرت کرنا اور دوری اختیار کرنا مذہب انسانیت کے خلاف ہے۔

شاعر نے اس بند میں احترامِ آدمیت کا درس دیا ہے۔۔۔۔ مگر قرآن کی تعلیم، دیگر مذاہب کی تلقین، نیک بندوں کی نصیحتوں کے باوجود حق و باطل کی کشمکش میں انسان انسانیت کے دوراہے پہ کھڑا ہے۔

؎ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

سوال نمبر5: درج ذیل میں سے کسی ایک غزلیہ جزو کی تشریح کیجیے: (3+3+3=9)

الف۔ خاک ہیں اب تیری گلیوں کی وہ عزت والے جو ترے شہر کا پانی نہ پیا کرتے تھے
اب تو انسان کی عظمت بھی کوئی چیز نہیں لوگ پتھر کو خدا مان لیا کرتے تھے
دوستو! اب مجھے گردن زدنی کہتے ہو تم وہی ہو کہ میرے زخم سیا کرتے تھے

جواب: شعر1 کی تشریح:

شاعر کہتا ہے کہ وہ لوگ جو کل تک اپنی انا کے خمار میں تھے اور تیرے کوچے کے ساتھ کوئی تعلق قائم کرنے کو اپنی خودداری کے منافی خیال کرتے تھے، آج وہی تمہاری گلیوں کی خاک بنے ہوئے ہیں۔ ان کا غرور اور تکبر خاک میں مل گیا ہے اور تمہارے جمال و جلال کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔ شعر میں محبوب کے حسن و جمال اور اس کی دل ربا اداؤں کو ایک معجزہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ وہ لوگ جن کا خیال تھا کہ وہ کسی کے عشق میں مبتلا نہیں ہو سکتے اور وہ کسی محبوب کے کوچے کے چکر نہیں کاٹ سکتے، انھیں اپنی اداؤں سے محبوب نے یوں گرفتار کیا ہے کہ وہ خاکساری کا نمونہ بن گئے ہیں اور محبوب کی گلیوں میں بے توقیر خار و خس کی صورت میں بچھے ہیں۔

شاعر نے دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ لوگ جو اپنے شملے اونچے رکھتے تھے اور اسی زعم میں کسی کے گھر سے پانی پینا اپنے لیے کسرِ شان سمجھتے تھے وقت نے ان کے لیے ایسا منظر بدلا کہ وہ گزرے وقت پر ہاتھ ملتے رہ گئے۔ بلاشبہ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کون کس وقت شاہ سے گدا، یا گدا سے شاہ بن جائے یہ تقدیر اور مقدر ہی کے اختیار میں ہے۔

؎ زمینِ چمن گل کِھلاتی ہے کیا کیا بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

مرزا غالب نے اپنی رسوائی کا شکوہ کچھ ان الفاظ میں کہا:

؎ نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں، لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

گویا عروج و زوال، امارت و غربت، زندگی موت، طاقت و ناتوانی دنیا میں کسی بھی شے کو دوام اور بقا نہیں۔ کسی کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے لیے وقت کا دھارا کس مرحلے پہ کیا صورت اختیار کرے۔ احمد فراز اسی لیے خبردار کرتے ہیں:

؎ پیچ رکھتے ہو بہت صاحبو دستار کے بیچ ہم نے سر گرتے ہوئے دیکھے ہیں بازار کے بیچ

شعر 2 کی تشریح:

شاعر کہتا ہے کہ زمانہ تیزی کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ ہر لحظہ منظر بدل جاتا ہے اور اس تبدیلی کے نتیجے میں کئی روایتیں دم توڑ دیتی ہیں اور کئی نئی روایتیں آغاز ہوتی ہیں۔ افسوس کہ اس ساری فضا میں انسان جو نائبِ خدا اور خلیفۂ ارض ہے، کی عظمت کا تصور دھندلانے لگا ہے۔ پہلے وقتوں میں انسان اپنی خوش عقیدگی سے پتھر کے بے جان بتوں کو بھی خدا تصور کر لیتا تھا مگر اب جب کہ وہ اپنے تئیں شعور کی کئی منزلیں طے کر چکا ہے، انسان کی عظمت و رفعت کا انکار کرتا ہے۔ عظمتِ بشر کا انکار اس کی بے سمتی اور زوال کا عکاس ہے۔ اگر اس کا سفر مثبت سمت میں ہوتا تو یقیناً وہ انسان کی فلاح و فوز کے لیے سرگرمِ عمل ہوتا اور عظمتِ انسان کے لیے جتن کرتا مگر اب صورت حال اس سے مختلف ہے۔ موجودہ عہد کا انسان خود غرضی اور نفسا نفسی کی کیفیت میں مبتلا ہے اور دوسرے انسانوں کو نقصان پہچانے اور انہیں اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

تاریخِ انسانی کا ایک دور تھا کہ انسان اپنے مزاج اور فطرت میں سادہ لوح تھا۔ جدید صنعتی معاشرہ ابھی اسے چُھو کر بھی نہ گزرا تھا۔ خود غرضی، مطلب پرستی اور ذاتی اناؤں کا دور دور تک نام و نشاں نہ تھا۔ خلوص، محبت، صلح و صفائی، امن و آشتی انسانی معاشرے کی سنہری روایات تھیں۔ انھی سماجی اقدار و روایات کا اثر تھا کہ انسان کے لیے انسان، انسانیت اور انسانی رشتے ہی سب کچھ تھے۔ لیکن آج ہمارا یہ حال ہے کہ

؎ آدمی آدمی سے ملتا ہے دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

بلاشبہ انسان کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انسان محبت و مروت اور خلوص کو فروغ دے لیکن مشینوں کی حکومت نے انسان کو انسان سے دور کر دیا ہے:

؎ ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

سائنسی ترقی نے انسان کو سہولیات اور آسانیاں تو دیں لیکن سادہ لوحی، محبت و مروت جیسے اوصاف سے انسان کو عاری کرتی جا رہی ہے۔ ہمیں اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرنے کی اشد ضرورت ہے:

؎ آدم کی کسی روپ میں تحقیر نہ کرنا پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر

شعر 3 کی تشریح:

شاعر نے اپنے دوستوں کی کج ادائی اور بے رخی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہی دوست جو کل تک میرے زخموں پر مرہم رکھتے تھے اور میری ہر تکلیف میں میری دل جوئی اور چارہ گری کرتے تھے، آج مجھے گردن زدنی خیال کرتے ہیں اور میرے وجود کو مٹانے کے درپے ہیں۔ بے حسی اور خود غرضی جدید عہد کے انسان کا ایسا المیہ ہے جو اسے اپنی روایات و اقدار سے محروم کرنے کا سبب ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہی لوگ جو کل تک میری دوستی کا دم بھرتے نظر آتے ہیں آج میرے جانی دشمن بنے ہوئے ہیں۔ موجودہ زمانے کی اس روش کو ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد یوں بیان کرتے ہیں:

؎ جو کل تلک مری قربت کے خواب بُنتا تھا وہ شخص اب مجھے پامال کرتا جاتا ہے

دوستی کا تقاضا ہے کہ مصیبت میں دوست کی غم گساری اور چارہ سازی کی جائے۔ مشکل اور مصیبت میں دوست کو تنہا اور اکیلا چھوڑنا بہت زیادتی کی بات ہے۔ اسی لیے تو مرزا غالب کہتے ہیں۔

؎ یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

میر دردؔ نے دوست احباب سے ان الفاظ میں گلہ کیا ہے:

؎ ایک میں دِل ریش ہوں ویسا ہی دوست! زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے

یعنی جس جس کے دوست نے مشکل، امتحان اور آزمائش کے وقت اس کا ساتھ دیا آج وہ ہر فکر پریشانی سے آزاد ہے لیکن میر درد پہلے جیسا غم زدہ ہے کہ اس کے دوست نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ دوست تو غم میں ڈھارس بندھاتا ہے۔ جینے کا حوصلہ، امید بڑھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناصر کاظمی کہتے ہیں:

؎ آج مشکل تھا سنبھلنا اے دوست تو مصیبت میں عجب یاد آیا

ب۔ شور برپا ہے خانۂ دل میں کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
تو شریک سخن نہیں ہے تو کیا ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

جواب: شعر 1 کی تشریح:

موسم برسات میں رم جھم ہوتی رہتی ہے، کبھی کبھار کوئی بوسیدہ مکان گر جاتا ہے تو ہر طرف شور برپا ہو جاتا ہے، آہ و بکا کی آواز آتی ہے۔ اس صورت حال کو شاعر نے اپنے دل کی کیفیت پر منطبق کیا ہے، کہتے ہیں کہ دل کے اندر برسات کی رم جھم ہے۔ اور یہ موسم دل میں افسردگی اور محرومی کا احساس پیدا کر رہا ہے اور رفتہ رفتہ یہ احساس زیادہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ دل کے ایک گوشے سے شور سا اٹھتا ہے جیسے کسی خستہ مکان کی دیوار گری ہو۔

ایک اور شاعر کے بقول:

؎ دیدنی ہے شکستگی دل کی کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

جناب ندیم قاسمی کی ایک معروف غزل کے مطلع میں بھی اس کیفیت کی نہایت عمدہ تصور کاری ملتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

؎ جب ترا حکم ملا ترک محبت کر دی دل مگر اس پہ وہ دھڑکا کہ قیامت کر دی

اس شعر کا دوسرا مفہوم خوشی والا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ دیوار گرنا، کور کاوٹ دور ہونے کے معنوں میں بھی لیا جاتا ہے اور دل میں شور اس کے خوشی سے بلیوں اچھلنے سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے بقول:

؎ مکانِ جسم پہ اس دل کی دستکیں بھی سنو! خوشی سے رقص میں ہے یار ہائی چاہتا ہے

یہاں شاعر نے من کی دنیا کی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے خارج کی دنیا کا حوالہ دیا ہے۔ ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ "دیوار سی گری ہے" یعنی کوئی بڑا راہ نما چل بسا ہے جس طرح دیوار گرنے سے ہم اس کے سائے سے محروم ہو جاتے ہیں، اسی طرح راہ نما کی وفات پر ہم اس کی چھاؤں سے محروم ہو گئے ہیں۔ ناصر کاظمی ہی کے بقول:

؎ میٹھے تھے جن کے پھل وہ شجر کٹ کٹا گئے ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

شعر 2 کی تشریح:

شاعر کو ایک نامعلوم سی بے چینی پریشان کیے رکھتی ہے اور اسے کسی طور اس دنیا میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ اسے اس بات کا بھی احساس ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ دنیا خوبصورت اور پر کشش ہے اور اس میں کروڑوں انسان بخیر و خوبی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں "جانے" کا لفظ نہایت خوبصورتی سے نہ جانے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ پھر شاعر خود ہی اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ جانے کس چیز کی کمی ہے۔ گویا باقی سب تو درست ہے صرف ایک چیز کی کمی نے اسے اداس کر دیا ہے مگر وہ چیز ہے کیا؟ یہ پتا نہیں چل رہا۔ یہ کمی نہ ہوتی تو دنیا میں جی لگ جاتا۔ ناصر کاظمی ہی کا ایک اور شعر ہے:

؎ اتنی خلقت کے ہوتے شہروں میں ہے سناٹا

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں:

؎ دل تو میرا اداس ہے ناصرؔ شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

بلکہ ایک جگہ دیکھیے کہ انھوں نے اپنی اداسی کے بیان کا کیا خوبصورت انداز اپنایا ہے وہ لکھتے ہیں:

؎ نہ ملا کر اداس لوگوں سے حسن تیرا بکھر نہ جائے کہیں

اصل بات تو یہ ہے کہ شاعر کا اپنا دل اداس ہے اور یہ اداسی دراصل محبت کے کیف سے محرومی کے سبب ہے، اس لیے اسے خارج کی دنیا بھی ادھوری اور ناتمام محسوس ہو رہی ہے۔

اداسی اور دل کا نہ لگنا ناصر کی شاعری کے مستقل موضوعات ہیں، جن کا وہ مختلف مواقع پر نئے نئے انداز سے اظہار کرتے رہتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:

؎ آج تو بے سبب اداس ہے جی　　عشق ہوتا تو کوئی بات بھی تھی

شعر 3 کی تشریح:

شاعر کو محبوب سے عموماً یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ مجھ سے ہم کلام نہیں ہوتا مگر شاعر اس کے ہم کلام نہ ہونے پر بھی مطمئن ہے اور کہی رہا ہے کہ تیرے ہم کلام نہ ہونے پر تیری خاموشی ہم کلام ہے یہاں خموشی گفتگو اور بے زبانی زبان بن گئی ہے۔ دو دوست اگر آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہیں تو آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کیفیت کو خورشید رضوی نے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے:

؎ وہ روز و شب کہ جن میں نگاہیں زبان تھیں　　ہم چپ تھے کوئی بات مگر اَن کہ نہ تھی

عہدِ حاضر کے معتبر شاعر ارشد نعیم نے دیکھیے اپنے دو اشعار میں اس صورت حال کا کیا عمدہ نقشہ کھینچا ہے، فرماتے ہیں:

؎ اس نے چہرہ ہی پڑھ لیا ہو گا　　ہو گئے ہم یہ سوچ کر خاموش

جنبشِ لب کے منتظر کیوں ہو　　صورتیں داستاں کی صورت ہیں

اس موضوع پر حکیم مومن خاں مومن کا یہ شعر تو سب سے بڑا نفسیاتی عکاس ہے:

؎ تم میرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس کے علاوہ جذبوں کو زبان دینے کا یہ دل فریب انداز ایک اور اچھوتے پیرائے میں ملاحظہ ہو:

؎ آؤ چپ کی زبان میں خاور　　اتنی باتیں کریں کہ تھک جائیں

دراصل ابلاغ کے ذرائع میں زبان کو اہمیت تو ہے لیکن یہ حرفِ آخر نہیں، مافی الضمیر تو کسی بھی انداز میں دوسرے تک پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً

؎ آنکھوں کی سیال تحریر میں جو بلاغت ہے　　لفظوں میں کب ہے!

سوال نمبر 6: اپنے علاقے کے ہیلتھ آفیسر کے نام صحت و صفائی کے ناقص انتظامات اور متعلقہ مسائل کے حوالے سے درخواست تحریر کریں۔ (8)

جواب: **درخواست:**

بخدمت جناب ہیلتھ آفیسر صاحب، شہر الف۔ ب۔ ج

عنوان: **درخواست برائے صفائی محلّہ**

جنابِ عالی!

مؤدبانہ گزارش ہے کہ ہم اہلیانِ محلّہ اپنے علاقے کے ایک مسئلے کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ گزشتہ ایک ماہ سے محلّے بھر کی صفائی کا انتظام ابتری کا شکار ہے۔ محلّے کی سڑکیں تو پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ ستم بالائے ستم کہ موسم برسات کی آمد آمد ہے۔ جس سے اندیشہ ہے کہ پانی جگہ جگہ کھڑا ہو جائے گا۔ یہ غلیظ پانی طرح طرح کی بیماریوں کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ صفائی کے عملے کی تو پوچھیں ہی نہ۔ جگہ جگہ پلاسٹک کے بیگ بکھرے پڑے ہیں۔ یہ تمام حالات ہمارے لیے تشویش کا باعث ہیں۔ براہ مہربانی ہمارے محلّے کی خاطر خواہ صفائی کے احکامات صادر فرمائیں۔

آپ کی مہربانی ہو گی۔

العارض

6 مارچ 2022ء

آپ کے شکر گزار اہالیان محلّہ شرقی

شہر الف۔ ب۔ ج۔

سوال نمبر 7: کسی ایک عنوان پر پانچ سو سے چھ سو الفاظ پر مشتمل مضمون تحریر کریں۔ (15)

الف: جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز　　ب: میری پسندیدہ کتاب

ج: سائنس کا ارتقاء　　د: ہماری سماجی برائیاں اور سدِ باب

جواب: مضمون:

الف: جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

تاریخ عالم پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ دنیا کے مختلف انقلابوں میں نوجوانوں اور طالب علموں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ علامی تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب آنحضورؐ کا لایا ہوا انقلاب تھا جو صحیح معنوں میں انقلاب کہلانے کا مستحق ہے۔ اس نے صرف ظاہری طور طریقے ہی نہیں بدلے بلکہ ذہنوں اور دلوں کو بدل کر رکھ دیا۔ اس انقلاب کے ہراول دستے میں جو لوگ شامل تھے، وہ سب نوجوان طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تحریک پاکستان میں بھی نوجوان طلبہ خصوصاً علی گڑھ اور اسلامیہ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم طالب علموں نے بڑی جانفشانی اور محنت کے ساتھ کام کیا۔ انھوں نے دور دراز دیہاتوں اور قصبوں میں پہنچ کر انفرادی ملاقاتوں اور جلسوں میں تقریروں کے ذریعے مطالبۂ پاکستان کے حق میں فضا ہموار کی۔ ان کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں رائے عامہ کا رخ بدل گیا اور وہ جوق در جوق تحریک پاکستان میں شامل ہوتے گئے۔ صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کا مرحلہ آیا تو طلب نے آگے بڑھ کر عوام کی راہ نمائی کی۔ صوبے کے غیور مسلمانوں نے قائد اعظم کی قیادت پر اعتماد کا اظہار کیا اور پاکستان کے حق میں رائے دی۔ خدا کے فضل و کرم سے پاکستان تو قائم ہو گیا لیکن اب اس کی بقا، سالمیت اور استحکام کا مسئلہ در پیش ہے۔ فی الحقیقت بڑی حد تک اس کا انحصار طلبہ ہی پر ہے۔ کسی بھی قوم کی تعمیر و ترقی میں طلبہ کا کردار بہت بنیادی ہوتا ہے۔ طالب علم جس قسم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، جس نہج پر ان کی تربیت ہوتی ہے، ویسا ہی ان کا ذہن بنتا ہے اور وہ جس شعبۂ زندگی میں جاتے ہیں، اپنے دائرہ عمل میں وہی اثرات ڈالتے ہیں۔

طلبہ کی سوچ بالعموم بے لاگ ہوتی ہے۔ وہ بڑے بوڑھوں کی طرح مصلحتوں کا شکار نہیں ہوتے اور نہ وہ سچی بات کہنے سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ وہ دنیاوی دھندوں اور بکھیڑوں سے آزاد ہوتے ہیں، اس لیے بھی دنیاوی منفعتوں اور نقصانات کی کچھ زیادہ پروا نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ جب وطن عزیز کی سلامتی سے متعلق کوئی مسئلہ در پیش ہوتا ہے تو وہ آگے بڑھ کر کلمہ حق بلند کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ پڑوسیوں میں بھارت سے ہمارے تعلقات کشیدہ ہیں۔ جب کبھی بھارت ہم سے کسی زیادتی کا ارتکاب کرتا ہے، پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتا ہے یا سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ کرتا ہے تو طلبہ جلسوں یا جلوسوں کی شکل میں شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، وہ کسی ملک کی کوئی ایسی حرکت برداشت نہیں کر سکتے ہیں، جس سے ہماری قومی سالمیت پر آنچ آتی ہو۔

1965ء میں بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو ہماری قومی سالمیت کو خطرہ لاحق ہوا۔ اس موقع پر نوجوان طلبہ نے حسب استطاعت ہر طرح کی خدمات انجام دیں۔ زخمیوں کے لیے بڑھ چڑھ کر خون کا عطیہ دیا۔ محاذ پر سامان رسد لے جانے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ شہری دفاع کے سلسلے میں بھی طلبہ نے حتی المقدور اپنا فرض ادا کیا۔ بہت سے طالب علم اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہو گئے اور یوں قومی دفاع اور سالمیت کے لیے اپنا سب کچھ پیش کر دیا۔

اسی طرح جب اشتراکی روس نے افغانستان پر حملہ کر دیا تو بہت سے طلبہ، خصوصاً دینی مدرسوں کے طلبہ کی بڑی تعداد، جہاد افغانستان میں شریک ہو گئی اور بہت سے طلبہ نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ اس کے بعد اب جہاد کشمیر میں بھی طلبہ حصہ لے رہے ہیں۔ شہدائے کشمیر کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم بھی شامل ہیں۔ یہ لوگ اپنے خون سے آزادی کشمیر کی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔

قومی سالمیت اور بقا میں حصہ لینے کے کئی طریقے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جو شخص جہاں ہے، اسے اپنا فرض نہیں بھولنا چاہیے۔ ضروری ہے کہ طالب علم اپنی تعلیم پر پوری توجہ دیں۔ اگر وہ اس میں غفلت برتیں گے تو ظاہر ہے اس صورتِ حال سے ملک و قوم مستحکم نہیں ہو سکتے۔ مزید برآں تعلیم کے ساتھ شخصیت کی تعمیر و تربیت بھی ضروری ہے کیونکہ پراگندہ ذہن کے ساتھ کوئی خدمت انجام نہیں دی جا سکتی۔ اس ضمن میں اسلامی اور تعمیری لٹریچر کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے۔ اسلام نے ہر شعبۂ حیات کے لیے مفصل ہدایات دی ہیں۔ قرآن و حدیث اور اسلامی کتب کا مطالعہ ذہنوں کو جلا بخشتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جدید علوم، عالمی تحریکوں اور مسائل سے واقفیت حاصل کرنا بھی از بس ضروری ہے۔ اخبارات و رسائل دیکھنا، پھر تعمیری انداز میں سنجیدہ گفتگو اور بحث و مباحثوں میں حصہ لینا ذہنوں کی مثبت تشکیل میں بہت مؤثر ہو سکتا ہے۔ علماء، اساتذہ اور دانشوروں سے تبادلۂ خیال بھی افادیت سے خالی نہیں۔ ایسے ہی باشعور طالب علموں سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ نہ صرف دوران طالب علمی، بلکہ تکمیل تعلیم کے بعد بھی، قومی سلامتی کے ہر مرحلے پر اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے، حسبِ موقع اپنا بھرپور اور مؤثر کردار ادا کریں گے۔

آزادی کے حصول کے بعد قوموں کے لیے سب سے کٹھن مرحلہ آزادی کو برقرار رکھنا اور تعمیر وطن کی رفتار تیز کرنا ہوتا ہے۔ بزرگ نسل یا قوم کے رہنما لائحہ عمل دیتے ہیں اور قوم کے نوجوان اسے عملی جامہ پہناتے ہیں۔ حب وطن، جوش کردار اور قوتِ کار سے وہ ایسے کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں جو تعمیر و ترقی میں بنیادی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ البتہ اس میں ایک ضروری عمل اپنی صلاحیتوں کا ادراک ہے۔ بقول اقبال:

؎ اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

آج ہمارا پیارا پاکستان بہت سے خطرات سے دوچار ہے۔ اس کی سرحدوں پر خطرات منڈلا رہے ہیں۔ نظریاتی سرحدوں کے انہدام کے لیے دشمن قوتیں مسلسل کوشاں ہیں۔ اس کے اسلامی تشخص اور اسلامی ممالک کے اتحاد میں پاکستان کے قائدانہ کردار کو کئی چیلنجز کا سامنا ہے۔ توانائی کی کمی، لوڈشیڈنگ اور مہنگائی کے طوفان نے عوام کے ہوش وحواس گم کر دیے ہیں۔ ایسے میں قوم کی نظریں پھر باروئے شمشیر زن یعنی طلبہ اور نوجوانوں کی طرف اٹھتی ہیں کہ وہی قوم کو ان خطرات سے باہر نکال سکتے ہیں۔

ب: میری پسندیدہ کتاب

جب میں نے جامع مسجد میں قرآن کریم ناظرہ مکمل کیا تو میرے استاد محترم نے مجھے ترجمہ اور تفسیر پڑھنے کی ترغیب دی۔ خوش قسمتی سے ہماری جامع مسجد میں اس کا عمدہ انتظام تھا۔ ایک پروفیسر صاحب جو کسی کالج میں اسلامیات پڑھاتے تھے، مغرب کے بعد ہفتے میں تین دن ترجمہ و تفسیر کی کلاس لیتے تھے۔ وہ اکثر قرآن میں مذکور انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کی امتوں کے قصے سنایا کرتے تھے۔ یوں بچپن ہی سے قرآن سے ایک خاص لگاؤ اور دلچسپی پیدا ہو گئی تو گویا میرے لیے ایک نئی دنیا کھل گئی اور ایک نعمت عظمیٰ میرے ہاتھ آ گئی۔ مجھے مطالعہ کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ کالج میں آ کر اس شوق کی تکمیل کے وسیع مواقع میسر آئے اور کالج لائبریری سے میں نے مذہبی، تاریخی، سائنسی اور ادبی کتب کا مطالعہ کیا۔ پیر کرم شاہ الازہری، نسیم حجازی، ممتاز مفتی، واصف علی واصف اور پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری کی کتب نے مجھے متاثر کیا۔ اردو شاعری مجھے احمد فراز، شکیب جلالی اور مجید امجد پسند آئے۔ احمد ندیم قاسمی، قدرت اللہ شہاب اور غلام عباس کے افسانوں نے دامن دل کھینچا۔ "یادوں کی بارات" سے لے کر "اپنے گریباں چاک" تک میں نے کئی سوانح عمریاں پڑھیں۔ میں اس حقیقت کا برملا اظہار کرتا ہوں کہ اس سب کے باوجود میری توجہ کا مرکز قرآن مجید ہی رہا۔ مخلوق کے کلام میں تمام تر خوبیوں اور رعنائیوں کے باوجود کہیں تشنگی اور کم مائیگی کا احساس رہا۔ خالق کا کلام ہر طرح کے عجز، کمی اور کمزوری سے پاک اور مبرا ہے۔ اس لیے قرآن مجید ہی میری پسندیدہ کتاب ٹھہرتی ہے۔

قرآن مجید فرقانِ حمید اللہ رب العزت نے اپنے محبوب رسول و پیغمبر خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر تقریباً تیئیس سال کے عرصے میں نازل فرمایا۔ جو سورتیں مکہ معظمہ میں نازل ہوئیں وہ مکّی کہلائیں جو مدینہ میں نازل ہوئیں مدنی کہلائیں۔ جن کی ترتیب نزولی نہیں توقیفی ہے 86 مکی سورتیں ہیں جبکہ 28 مدنی سورتیں ہیں۔ قرآن مجید میں 7 منزلیں، 14 سجدے، 30 پارے، 6236 آیات اور 558 رکوع ہیں۔

قرآن رب ذوالجلال کا بے مثال، باکمال اور لازوال کلام ہے۔ اس کے امتیازات، ثمرات، فرمودات اور واقعات دلکش اور دلنشین ہیں۔ اس کی برکات، اس کی تجلیات اور اس کی آیاتِ بینات اس کے اعجاز پر گواہ ہیں۔ کوئی اس کے معنی، مطالب، رموز، اسرار اور مفاہیم میں ڈوب کر اس کی عظمتوں کا اندازہ کرنا چاہے، کوئی اس کی تمثیلات، استعارات، اشارات اور تلمیحات سے اس کی انفرادیت کا کھوج لگانا چاہے، کوئی اس کی صداقت و عدالت پر قربان ہونا چاہے، کوئی اسے تحریر، تقریر اور تاثر کے روپ میں دیکھنا چاہے، کوئی اسے مصاحت و بلاغت کے معیار پر پرکھنا چاہے، کوئی اسے اجر و ثواب اور رفعت و عظمت کے زاویہ نگاہ سے دیکھے، کوئی اسے تعظیم و تکریم اور تعریف و توصیف کے انداز میں جانچنا چاہے، کوئی اسے برکت، رحمت، ہدایت، بشارت، موعظت اور تلاوت کے رنگ میں ملاحظہ کرنا چاہے، کوئی اسے تحفیظ، ترتیب، تدوین، تفسیر اور تشریح کے پیمانے پر ماپنا چاہے، اللہ کے جلال اور جمال کی قسم ہر لحاظ سے معجزہ ہے۔

؎ آں کتاب زندہ قرآں حکیم — حکمت اولایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوین حیات — بے ثبات از قوتش گردد حیات
نوعِ انساں را پیام آخریں — حامل اور حمۃ اللعالمین (اقبالؒ)

ترجمہ: قرآن حکیم وہ زندہ کتاب ہے جس کی حکمت لازوال اور دائمی ہے۔ زندگی اور کائنات کے تمام راز جاننے کا یہ نسخہ ہے اس کی طاقت سے بے ثبات کو ثبات مل جاتا ہے۔ یہ نوعِ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے جو حضورؐ رحمۃ اللعالمین لے کر آئے۔

قرآن مجید الحمد سے لے کر والناس تک لاکھوں سینوں میں من و عن محفوظ ہے یہ ذریعۂ نجات بھی ہے اور وسیلۂ مغفرت بھی، یہ دوا بھی ہے اور شفا بھی، تسکینِ قلب و جاں اور باعث ایمان ہے۔

؎ گر تو می خواہی مسلمان زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

ترجمہ: اگر تو چاہتا ہے کہ کامل مسلمان بن کر زندگی بسر کرے تو یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ قرآن کو زندگی بنا لے۔

دین اسلام میں قرآن کی حیثیت "فرقان" یعنی حق و باطل کے معیار کی ہے۔ جس عقیدے و عمل کو یہ حق قرار دے، وہ حق ہے اور جس فکر و عمل کو یہ غلط قرار دے، وہ غلط ہے۔ گویا قرآن اسلام کی کسوٹی ہے۔ ہر مسئلے اور معاملے کو قرآن ہی کے ذریعے پرکھا اور دیکھا جائے گا۔ قرآن دین کے لیے

"میزان" بھی ہے یعنی ہر عقیدہ وخیال اور ہر عمل کو قرآن کریم کے میزان میں تول کر دیکھا جائے گا کہ اس کا وزن کیا ہے۔ قرآن "احسن الحدیث" یعنی بہترین کلام اور عمدہ ترین بات ہے۔ قرآن "برہان" یعنی مضبوط، روشن اور ہر حال میں سچی دلیل بھی ہے۔ قرآن "بلاغ" یعنی لوگوں کے نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام ہے۔ قرآن "تذکرہ" یعنی نصیحت اور یاد دہانی ہے۔ قرآن "حق" یعنی ایسی بات ہے جو ثابت، قائم اور اٹل ہے۔ قرآن "حکم" یعنی فیصلہ، ماخذ قانون اور ضابطۂ حیات ہے۔

قرآن کتاب ہدایت ہے۔ یہ ہمارا تعلق دورِ رسالت سے جوڑتا ہے پھر وہاں سے حاصل کردہ روشنی سے ہم مستفید ہوتے ہیں۔ مکی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے لوگوں کو اللہ کی طرف تو دنیا اور کائنات کی حقیقت، اس کے خالق کی صفات، دنیا میں انسان کے کردار اور انسان کے مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے اور یومِ حساب سے متعلق واضح ہدایات دیں۔ مدنی دور میں قرآنی احکامات کا نفاذ عمل میں آیا۔ قرآن کے مطالعہ سے صاحب قرآن حضورؐ کی زندگی کا ایک ایک گوشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آیات کن واقعات کے حوالے سے نازل ہوئیں، شانِ نزول کے فہم سے ہمیں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہدایات میں آسانی رہتی ہے۔

قرآن میری پسندیدہ کتاب اس لیے بھی ہے کہ اس نے انسانوں کو فلاح دارین سے نوازا ہے۔ قرآن نے نیک اعمال کی ترغیب دی ہے۔ تاکہ انسان جنت کی رحمتیں حاصل کر سکے۔ قرآن میں حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا جائے اور مخلص ہو کر اس کی عبادت کی جائے۔ جو لوگ ایمان اور تقویٰ کے ساتھ نیک اعمال بجالائیں گے ان کے لیے جنتیں ہیں۔ زنا کے قریب نہ جاؤ، یہ کھلی بے حیائی ہے۔ نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ روزہ رکھنے سے پرہیز گاری ملتی ہے۔ حج کرنا باعثِ سعادت ہے۔ زکوٰۃ وصدقات سے مال پاک ہوتا ہے اور رضا الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ قرآن نے حق بات کہنے، وعدہ پورا کرنے، سچ بولنے، عدل وانصاف، احسان اور والدین سے حسن سلوک کے احکامات دیے ہیں۔ قرابت داروں، عورتوں، بچوں اور ناداروں سے احسن رویہ اپنانے کا کہا ہے۔ قرآن نے غیبت، جھوٹ، چغلی، حرام کمائی، فرقہ پرستی، سود خوری اور شراب نوشی سے منع فرمایا ہے۔ خیانت، فحاشی، جوا، بُخل، اسراف، قتلِ ناحق بڑی برائیاں ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔ نبیؐ کی شانِ اقدس میں بے ادبی سے انسان کے سارے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ ارشاد ہے: "جس نے اللہ کی اطاعت کی اس نے رسولؐ کی اطاعت کی"۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات تخلیق فرمائی اور قرآن اللہ کا کلام ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں اور رسولوں میں یہ سعادت اور اعزاز صرف نبیؐ اور قرآن کو ہی حاصل ہے کہ باقی آسمانی کتابوں کی طرح اس میں ایک زیر کا بھی فرق نہیں آیا اور نہ آئے گا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے یہ ذکر ہم نے نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس کلام میں جابجا کائنات کی تسخیر کا حکم ہے کیونکہ نظام کائنات کے عقلی فہم وادراک کا نام سائنس ہے۔ صدیوں کی جستجو کے بعد سائنس جن حقائق تک پہنچی ہے ان کا بیان قرآن میں موجود ہے۔ قرآن نے تدبر، تفکر اور تحقیق پر زور دیا، کائنات کی تخلیق کے حوالے سے قرآن بتاتا ہے کہ زمین وآسمان تخلیق سے پہلے دھواں تھا۔ ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ انسان کو مٹی کی ایک حالت سے پیدا کیا گیا۔ جس میں پانی کی آمیزش تھی۔ پہاڑوں کو میخیں بنایا گیا۔ آسمان کی وسعتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر سیارہ اپنے فلک میں تیر رہا ہے۔ قرآن نے ماں کے پیٹ میں بچے کی تخلیق کے مراحل اور اس کا تین پردوں میں پرورش پانا بیان کیا ہے۔ یہ تمام حقائق جدید تحقیقات کے مطابق ہیں۔ مختلف انبیاءؑ کے قصے، سمندر میں میٹھے اور نمکین پانی کا بہنا، فرعون کی لاش کا محفوظ رہنا، شہد کی مکھی، اونٹ کی زندگی کی طرف اشارہ، دن رات کا بدلنا، زندگی کے معاملات، قیامت کی ہولناکیاں، جنت کی رنگینیاں، نبیؐ پر دین کی اشاعت پر ہونے والے ظلم، سفر معراج، طلاق کے احکامات، منہ بولے بچوں کے معاملات، بیویوں کے حقوق، ماؤں کے حقوق اور پردے کے احکام غرض کوئی ایسا موضوع جس کا رہتی دنیا سے تعلق ہے موجود ہے۔ اس عظیم کتاب نے عربوں جیسے معاشرے میں انقلاب پیدا کیا بلکہ پوری دنیا کو تمدن کی راہیں دکھائیں۔

الغرض مفکرین اور دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن رُشد وہدایت کا سرچشمہ اور سراسر انقلابی کتاب ہے۔ امت مسلمہ کے جملہ امراض کے لیے نسخۂ شفا ہے ملت کے تنِ مردہ میں از سرِ نو جان ڈالنے کے لیے آبِ حیات ہے یہی میری پسندیدہ کتاب ہے۔

ج: سائنس کا ارتقاء

ابتدائے آفرینش ہی سے انسان عناصر فطرت اور مناظرِ کائنات کے بارے میں غور وفکر کرتا آیا ہے۔ قدرت کی طرف سے تحقیق وتجسس کا جو جذبہ اسے ودیعت ہوا ہے، اس نے اسے اور اس کے ذہن کو سو سو طرح سے مصروف اور سرگرم کار رکھا ہے۔ کائنات کی بے کراں وسعتیں، آسمان پر جگمگاتے ہوئے تارے، سورج اور چاند کا طلوع وغروب، دن رات کی گردش، موسموں کا تغیر وتبدل، گھنگھور گھٹائیں، برستے بادل، چمکتی بجلی، آندھیاں اور طوفان، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ، اژدہوں کی طرح پھنکارتی ہوئی لہروں والے پرشور وربا اور حد نظر تک پھیلے ہوئے سمندر، سبھی اس کے فکر وتخیل کو مہمیز لگاتے رہے ہیں۔ اپنے فطری ذوقِ جستجو سے کام لیتے ہوئے انسان نہ صرف ان عناصرِ فطرت اور مظاہر کائنات کو سمجھنے

کی کوشش کرتا رہا ہے بلکہ اپنے مقاصدِ زندگی کے حصول کی خاطر ان سے کام لینے کی حتی المقدور سعی بھی کرتا رہا ہے اور یہی وہ سعی ہے جسے ہم سائنس کا نام دیتے ہیں۔

انسان نے جنگلی درندوں سے محفوظ رہنے، غاروں کو اپنا مسکن بنانے اور جنگلی جانوروں کے شکار کے لیے ہڈیوں اور پتھروں سے اوزار اور ہتھیار بنائے تو یہ اس کی (سائنسی) ارتقاء ہی تھی۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو احسنِ تقویم پر پیدا کیا اور اسے اشرف المخلوقات کے اعلیٰ وارفع لقب سے نوازا ہے۔ انسان کی دیگر مخلوقات پر یہ برتری اس وجہ سے ہے کہ قدرت نے اس کے اندر سیکھنے اور (علم) حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ اسے بہترین دماغی صلاحیتوں سے نوازا ہے اور وہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مسلسل ترقی و ارتقاء کی منزلیں طے کرتا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مظاہر قدرت کو تسخیر کرنے اور زمان و مکان کے سربستہ رازوں کو معلوم کرنے کا جذبہ روزِ اول سے ہی انسان کے اندر موجود ہے۔ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا نیلگوں آسماں، ستاروں کی گردش، اور دیگر مظاہر اس کی تجسس کی حس کو ابھارتے ہیں۔ وہ اپنے زندگی کے بنیادی تقاضوں کی تکمیل کے لیے ان مظاہر پر غور کرتا ہے۔

سائنس علم ہی کی ایک شاخ ہے اور قرآن حکیم انسان کے تحصیل علم کے جذبے کو متحرک کرنے کے لیے اسے بار بار جھنجھوڑتا ہے۔ اسے غور وخوض کرنے، مشاہدہ کرنے اور نتائج اخذ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائنس خلافِ مذہب علم نہیں بلکہ مذہبی اصولوں کے عین مطابق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: **ولقد سخرنا لکم مافی الارض جمیعا**

قرآن پاک جگہ جگہ انسان سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ کائنات کی مخفی قوتوں کو اپنے احاطۂ علم میں لا کر انسانیت کی تعمیر کرے اور انسانوں کی فلاح وبہبود کے لیے انہیں اپنے استعمال میں لائے۔ علامہ اقبال اسی قرآنی منشاء کو یوں بیان کرتے ہیں کہ:

؎ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے　　سرِّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

موجودہ عہد کو سائنس کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ سائنس نے حقائق کا انکشاف کر کے انسان کو توہم پرستی سے نجات دلائی ہے اور اسے یقین واعتماد کی قوت بخشی ہے۔ مظاہر فطرت کے مطالعہ و تسخیر سے جہاں انسان کے اپنے مادی و بنیادی تقاضے پورے ہوئے ہیں وہاں اسے خالق کائنات کی عظمت و جبروت سے بھی آگاہی ہوئی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو سائنس نے خالق و مخلوق کے مابین ایک پل کا کردار ادا کیا ہے۔

آج کے دور میں سائنسی ایجادات ہماری زندگی کے تمام شعبوں کا جزو لاینفک بن گئی ہیں۔ ان ایجادات اور اختراعات نے ہمیں بڑے سے بڑے سکھ اور اعلیٰ سے اعلیٰ راحت اور آرام سے نوازا ہے۔ انسانی معاشرت اور طرزِ زندگی میں ترقی انہیں سائنسی کرشمات کی مرہون منت ہے۔ گھریلو زندگی ہو یا سفر و حضر، صنعت و حرفت ہو یا زراعت، صحت و طب ہو یا تعلیم و تربیت، خبر رسانی ہو یا نقل و حمل، سیر و تفریح ہو یا حرب و دفاع۔۔۔ انسانی زندگی غیر محسوس انداز میں سائنسی طلسم میں جکڑی ہے اور ارتقاء و ترقی کا یہ سلسلہ ابھی بھی جاری و ساری ہے۔

؎ چھو لے نہ بندگی کہیں دامن خدائی کا　　معراج ارتقائے بشر دیکھتا ہوں میں

سائنس کا آغاز تو تب ہی ہو گیا تھا جب قدیم انسان نے سادہ ترین مشینیں مثلاً لیور اور پہیہ وغیرہ بنائیں اور لڑنے بھڑنے کے لیے لوہا دریافت کیا لیکن یہ عمل خاصا سست رہا۔ اسلام کے منظر شہود پر آنے کے بعد مسلمان اپنے پیارے نبیؐ کی تلقین پر لبیک کہتے ہوئے دیوانہ وار تعلیم و تحقیق کی طرف لپکے اور پھر جستجو و تلاش کا وہ عمل شروع ہوا جو جدید سائنس کی بنیاد بنا۔ جابر بن حیان، موسیٰ الخوارزمی، ابوالقاسم الزہراوی، ابن نفیس، بوعلی سینا، یعقوب الکندی، ابن الہیثم اور البیرونی وہ نامور مسلمان علماء تھے جنہوں نے جدید سائنس کو خدوخال عطا کیے جس دور میں یہ جید علماء علم و فن میں قابل قدر ترقی کر رہے تھے تب یورپ اپنی تاریخ کے سیاہ ترین دور سے گزر رہا تھا اور فرانس و انگلستان کے امراء اپنے ناموں کے ہجے سیکھ رہے تھے۔

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد جدید سائنس کے موجودہ دور کا آغاز ہوا۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کا پھیلاؤ انتہائی وسیع پیمانے پر ہونے لگا۔ اس سے قبل کتب محدود پیمانے پر لکھی جاتیں اور ان کی چند ایک نقول سے قارئین کی قلیل تعداد ہی استفادہ کر پاتی۔ جدید چھاپہ خانے کی بدولت کثیر تعداد میں کتب، رسائل اور تحقیقی مضامین منظر شہود پر آنے لگے اور انہوں نے قارئین کا وسیع حلقہ پیدا کر لیا۔ علم عام ہو گیا اور تحقیق و ترقی کا کام بھی نہایت سرعت پذیر ہو گیا۔ اس چیز نے زندگی کے مختلف شعبوں پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب کیے۔ علم کے پھیلاؤ کی وجہ سے سائنس کو مختلف شاخوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ حیوانیات، نباتات، کیمیا، طبیعیات، برقیات، طب، ریاضیات وغیرہ ان شعبوں میں تحقیق و تجربات کا سلسلہ نہایت وسیع ہو گیا اور نتیجتاً طرح طرح کی مشینیں معرض وجود میں آگئیں۔

وہ گھریلو اشیاء جو پہلے ہاتھوں سے اور محدود پیمانے پر تیار ہوتی تھیں اب کارخانوں میں مشینوں کی بدولت لاکھوں کی تعداد میں بننے لگیں۔ عام لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہوا اور وہ آسائشیں جو صرف طبقۂ امراء کو حاصل تھیں ان سے عوام الناس بھی استفادہ کرنے لگے۔ یہ سب سائنس کے ذریعے برپا

ہونے والے صنعتی انقلاب کی بدولت ممکن ہوا۔ سائنس کی بدولت آج کا انسان ایک طرف چاند پر اپنے قدم رکھ چکا ہے اور دوسری جانب اس نے قدرت کے خزانوں کی تلاش کے لیے بحر و بر کی گہرائیوں کو کھنگال ڈالا ہے۔

میرے ذوق تسخیر فطرت کے آگے عناصر کا قلب و جگر کانپتا ہے

سائنس نے انسان کی قدیم نا آسودہ خواہشات کو آسودگی بخشی ہے۔ اور اس کے پریشان خوابوں کو تعبیر عطا کی ہے۔ پرندوں کی طرح ہوا کے دوش پر سوار ہونا اور مچھلیوں کی طرح تہہ سمندر میں تیرنا اب حقیقت کا روپ دھار چکا ہے۔ سائنسی شعور نے ہماری زندگی کو سراپا انقلاب بنا دیا ہے۔ ماضی کی ناممکن باتیں، آج ممکن ہو گئی ہیں اور قدیم قصے کہانیوں میں جان سی پڑ گئی ہے۔ سائنسی استعداد نے انسان کو خود اعتمادی کا فخر اور طاقت کا غرور عطا کیا ہے۔ سائنسی کرشمات نے قدیم دیومالائی داستانوں کے محیر العقول کرداروں اور الف لیلہ و لیلہ کے درجنوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

سائنس میں تحقیق و ترقی کی بدولت جو ایجادات ہوئی ہیں ان سب کا اس مختصر مضمون میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا تاہم کچھ کا اجمالی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

نقل و حمل و رسل و رسائل کے شعبے میں موٹر کار، بس، ریل گاڑی، بحری اڈا، ہوائی جہاز آج کے انسان کے معمولاتِ زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ انسانی ذہن رسا نے محض ان کی ایجاد پر قناعت نہیں کی بلکہ ان ایجادات کو مفید سے مفید تر اور زیادہ آرام دہ و سبک رفتار بنانے کی مسلسل کوشش میں لگا ہوا ہے۔ آواز کی رفتار سے زیادہ تیز ہوائی جہاز، سینکڑوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑنے والی گاڑیاں اور ہزاروں ٹن بوجھ اٹھا کر تیرنے والے بحری جہاز اب انسان کی خدمت میں سرگرم عمل ہیں۔

چاند پر سوت کاتنے والی بڑھیا کی تلاش میں انسان نے خلائی راکٹ، چاند گاڑیاں، خلائی اسٹیشن اور مصنوعی سیارے بنا ڈالے ہیں۔ جنہوں نے نہ صرف اسے خلا کی لامحدود وسعتوں کی خبر دی ہے بلکہ اسے زمین پر ہونے والے موسمی تغیر و تبدل سے بھی آگاہ کیا ہے۔

بجلی کی کڑک اور چمک سے سہم جانے والے انسان نے آج طاقت کی اس دیوی کو اپنی مٹھی میں بند کر رکھا ہے۔ آج یہ اس کی تاریخ ایک راتوں کو روشن کرتی ہے۔ اسے موسموں کی سختیوں سے بچاتی ہے۔ اس کے لیے کھانا تیار کرتی ہے۔ اس کے کپڑے دھوتی اور پھر کپڑوں کی شکنوں کو دور کرتی ہے۔ اس کا پیغام ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی ہے۔ اس کے کارخانوں کو چلاتی ہے اور اس کے ذرا سے اشارے پر وہ کام کر گزرتی ہے جو ہزاروں انسان مل کر نہیں کر پاتے۔

ٹیلی گراف، ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی وژن اور فیکس مشین نے دنیا کی تمام وسعتوں کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے آج دنیا میں کسی دور افتادہ گوشے میں کوئی افتاد آتی ہے تو پلک جھپکتے ہی یہ خبر چار دانگ عالم میں پھیل جاتی ہے اور انسان، انسان کی مدد کو لپکتا ہے۔ دنیا کے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے شخص کی خوشی کو دوسرے کونے میں بیٹھا ہوا شخص اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ ان ایجادات نے انسان پر تفریح، سیر دو عالم اور معلومات کے ان گنت در وا کر دیے ہیں۔

آج کے مریض کو جو آسائش حاصل ہیں، ماضی میں ان کا تصور بھی محال تھا۔ انسان دنیا سے چیچک، طاعون، ملیریا، پولیو اور دیگر کئی بیماریوں کا قلعہ قمع کر چکا ہے۔ ایکس ریز، الٹرا ساؤنڈ، سی ٹی سکین مشینوں کی مدد سے اس کے جسم کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی بیماریوں کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔

عمل جراحی کے لیے جدید ترین لیزر مشینیں دریافت ہو چکی ہیں جو خون کا ایک قطرہ نکالے بغیر بڑے سے بڑے آپریشن کر ڈالتی ہیں۔ پلاسٹک سرجری، ایک بدصورت خاتون کو حسینۂ عالم اور بوڑھے آدمی کو نوخیز نوجوان کا روپ دے دیتی ہے۔ اعضاء کی پیوند کاری معمول بن چکی ہے اور "دل میرا دھڑکن تیری" کے مصداق ایک انسان کا دل دوسرے کے سینے میں دھڑکنا شروع کر دیتا ہے۔

نباتات و زراعت کے شعبے میں بھی سائنس کا کردار قابل ستائش ہے۔ آج گندم، گنا، کپاس، چاول، دالوں اور دیگر اجناس کے ایسے ترقی یافتہ بیج تیار کیے گئے ہیں جو نہ صرف زیادہ پیداوار دیتے ہیں بلکہ فصل کو مختلف بیماریوں سے بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ مشینی آلات مثلاً ٹریکٹر، ہارویسٹر، تھریشر لیزر لیولنگ مشین نے زراعت کے کٹھن کام کو آسان بنا دیا ہے۔ کیمیائی کھادوں نے زمین کو زرخیز بنایا ہے اور ٹیوب ویل نے آبپاشی میں سہولت دی ہے۔

حیاتیات کے میدان میں جینیاتی (Genetics) شعبے کی ترقی سائنس کا ایک طلسماتی کرشمہ ہے۔ کلوننگ، جو کہ ایک جنسیاتی عمل ہے کی بدولت ہم شکل و ہم خصلت جاندار پیدا کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ اس ٹیکنالوجی کی بدولت اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل انسان کی کاپیاں یعنی ہمزاد انسان تیار کیے جا سکتے ہیں۔

مواصلات کے ضمن میں سائنس کی ایک حیرت انگیز ایجاد سیل فون ہے۔ بغیر تار کے اس ہلکے پھلکے ٹیلی فون نے انسان کو بہت سی فکروں سے آزاد کر دیا ہے۔ گفتگو، پیغام رسانی، تصویر کشی، فلم سازی، موسیقی، حساب کتاب، جنتری و تقویم اور دیگر ان گنت افعال اس آلے کی مدد سے سرانجام دیے جا سکتے ہیں۔ دنیا بھر کی اطلاعات و خبریں، نشریات اور تفریح طبع کے سامان فراہم کرتا ہے۔ گویا یہ فون نہیں بلکہ جمشید کا جام ہے جس میں ساری دنیا کا عکس نظر آتا ہے۔

ے اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا جام جم سے میرا جام سفال اچھا ہے

آج سیل فون، جام سفال کی صورت میں ہر شخص کی جیب کی زینت ہے۔

سائنس کا ایک جدید ترین کرشمہ کمپیوٹر کی ایجاد ہے۔ اولاً تو کمپیوٹر محض حساب کتاب کی مشین تھا لیکن آج یہ پوری دنیا کے ہر شعبے کو اپنے طلسماتی گرفت میں لے چکا ہے۔ انسانی ذہن کو سامنے رکھ کر بنائی گئی اس مشین نے تعلیم و تحقیق، صنعت و حرفت، خوراک و زراعت، نشر و اشاعت، طب و جراحی، معدنیات و موسمیات، ارضیات و فلکیات غرض کہ ہر شعبہ پر اپنی بالادستی قائم کر دی ہے۔ آج تعلیمی اداروں، بنکوں، کارخانوں، دفتروں، کھیل کے میدانوں حتیٰ کہ گھروں میں کمپیوٹر نصب ہیں اور تمام افعال کو بڑی کامیابی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ کمپیوٹر کے ذریعے ساری دنیا آپس میں منسلک ہو گئی ہے چنانچہ آج کا انسان اس وسیع و عریض دنیا کو گلوبل ویلج کے نام سے یاد کرتا ہے۔

حرب و دفاع کے شعبے میں تیر، تلوار، بندوق اور توپ ایک قصۂ پارینہ ہو چکے ہیں۔ اب ان کی جگہ راکٹ، میزائل، لیزر بموں، جنگی طیاروں، آبدوزوں اور ایٹمی ہائیڈروجن بموں نے لے لی ہے۔ چنانچہ اب جنگ و جدل افرادی قوت، عددی برتری اور شجاعت و بہادری کا نام نہیں رہا بلکہ اب سائنسی تکنیکی برتری ہی فتح و شکست کی ضامن ہے۔

غرض یہ کہ سائنس نے انسانی زندگی میں بے شمار آسانیاں، آسائشیں اور سہولتیں پیدا کیں۔ انسان کا کھانا، پینا، نہانا، دھونا، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا، اوڑھنا، بچھونا سب کچھ سائنس کا مرہون منت ہے۔

ہر چیز کا حسن استعمال بھی ہوتا ہے اور سوءِ استعمال بھی۔ انسان نے ذرے کا دل چیر کر جوہری توانائی مقید کی ہے، وہ یقیناً انسانی جوہر اندیشہ گرمی کا حاصل ہے مگر اس توانائی سے ایسی ایسی ہلاکت آفریں ایجادیں بھی ہوئی ہیں کہ اگر انسان ایک لمحے کے لیے حیوان ہو جائے تو پلک کی ایک جھپک میں ہنسی، کھیلتی، بولتی، مسکراتی دنیا موت کے عمیق غاروں میں گر سکتی ہے۔ ماضی قریب میں مہذب و متمدن انسان نے اسی حیوانیت کا ثبوت دیا ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے زخم وقت کی گردشیں ابھی تک مندمل نہیں کر سکیں۔ اگر ایک طرف سائنس کے فیوض و برکات بے حساب ہیں تو دوسری طرف اس کی ہلاکت آفرینیاں بھی اس قدر بے کراں ہیں کہ اسے محسوس کر کے دل کانپتا اور روح لرزتی ہے۔

کاش انسان درد دل کی دولت سے مالا مال رہے اور دنیا میں ہمدردی، محبت، اخوت اور جذب باہمی کی ایسی فضا قائم کرے کہ اگر کسی دور افتادہ گاؤں میں کسی انسان کے پاؤں میں کانٹا چبھے تو دوسرا انسان اس کانٹے کی خلش اپنے دل میں محسوس کرے اور یہی خالق و مالک کے اس منشاء کا مقصود ہے جس کے تحت اس نے انسان کو علم و حکمت کے خزانے عطا کیے تھے اور اسے فرشتوں سے برتر بتایا تھا۔

ے یہی ہے عبادت، یہی ہے دین و ایماں کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

د: ہماری سماجی برائیاں اور سدِباب

معاشرتی مسائل کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے۔ یہ ہماری مختلف سماجی و نفسیاتی حالتوں کی علیحدہ علیحدہ یا مشترکہ اثرات کی پیداوار ہے۔ ان سے ہر حالت میں انسان انفرادی یا اجتماعی صورت میں متاثر ہوتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ کوئی امر مانع ہے جس سے اس کی ترقی ساکت ہے اور اس کا دل نفسیاتی طور پر ضروری خیال کرتا ہے۔ مسئلہ کی کوئی بھی صورت ہو یہ منفی اثرات، افراد کے رویوں، رکاوٹوں اور انحراف کی ایسی صورت ہے جس سے آدمی متاثر ہوتا ہے۔ معاشرتی مسئلہ ایک ایسی حالت ہے جو معاشرہ کی اعلیٰ اقدار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ معاشرتی مسئلہ، معاشرتی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہو سکتا ہے اور معاشرتی تغیر کی نمو اس وقت ہوا کرتی ہے جب لوگ موجودہ سماجی نظام سے کسی ـــــ نظام کے متلاشی ہوں۔

غربت پاکستانی معاشرے کا اہم اور قابلِ غور مسئلہ ہے۔ حضورؐ کا فرمان ہے:

"کبھی کبھار آدمی غربت کی وجہ سے اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور کبھی کبھار حسد تقدیر پر غالب ہو جاتی ہے۔"

غربت کی بنیادی وجوہات میں وسائل کی عدم دستیابی شامل ہے۔ ہمارے ہاں جو وسائل موجود ہیں ان سے پورا پورا استفادہ نہیں کیا جا رہا اور اس کا حتمی نتیجہ غربت ہی برآمد ہوتا ہے۔ وسائل کا بھرپور فائدہ نہ اٹھانا دراصل افرادی قوت میں تربیت یافتہ کارکنوں کی کمی کا بدولت ہے۔

غربت بذاتِ خود کئی معاشرتی برائیوں اور جرائم کا سدِباب ہے جس میں سرفہرست جہالت یا ناخواندگی ہے۔ قوموں کی ترقی ان کے شعور اور بیداری سے جانچی جاتی ہے اور ان کا تعلق وہاں کی خواندگی کے تناسب سے ہوتا ہے۔ تعلیم کسی معاشرے کی ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہے اور تعلیم کا فقدان معاشرے میں برائیوں اور دقیانوسی روایات کا موجد ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں تعلیم کو صرف پڑھنے لکھنے کا ہنر گردانا جاتا ہے جو کہ ایک غلط اور خطرناک سوچ ہے، تعلیم میں جب تک تحقیق کو ایک خاص مقام نہ دیا جائے تعلیم فائدہ مند نہیں ہو سکتی ہے۔ نظامِ تعلیم میں رکاوٹ کی متعدد وجوہات ہیں جن میں والدین کی ناخواندگی اور علم کی افادیت کی جان کاری سے محرومی، سیاسی استحکام کی غیر موجودگی جس کے باعث آئے روز ہڑتالوں اور ہنگاموں کی خبریں، مناسب

نوکریوں اور ملازمتوں کی عدم فراہمی، جس کی بدولت نوجوانوں میں غیر دلچسپی سے بد دلی کا پیدا ہونا، تعلیمی اداروں کی کمی کے سبب طلبا کا دور افتادہ تعلیمی اداروں کا رخ کرنا، راستے کی کوفت اور اخراجات کا ناقابلِ برداشت بوجھ سہنا، تعلیم کو خیر باد کہنے کا باعث بنتا ہے۔

گداگری جیسی لعنت بھی ہمارے معاشرے میں پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ ڈکشنری آف سوشیالوجی کے مطابق:

"گداگر یا بھکاری سے مراد وہ شخص ہے جو عادتاً دست سوال دراز کرتا ہے اور اصولی اور قانونی طور پر معاشرہ اس کی کفالت کا ذمہ دار نہ ہو۔"

گداگر چاہے مجبور ہو یا بے کس، انسانیت کے نام پر دھبہ ہے۔ یہ ایسی برائی ہے جو خودی کو ختم کر دیتی ہے اور یہ افراد معاشرہ کی نظر سے گر جاتے ہیں۔ اس کی وجوہات میں غربت، سہل پسندی اور کام چور، معذوری وغیرہ ہیں۔ گداگری کی ایک وجہ بے روزگاری بھی ہے۔

مملکتِ پاکستان میں لوگوں نے بے روزگاری سے تنگ آکر لاقانونیت کو اپنا لیا ہے۔ بے روزگاری اکثر وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم سے ہی وجود میں آتی ہے۔ بھوک اور بے روزگاری کی چکی میں پسنے والے لوگ اکثر جرائم کی طرف چل نکلتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ لوگ بندوق اٹھالیں، جعلسازی، اسمگلنگ، منشیات فروشی اور ایسے دیگر جرائم کی طرف لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد مائل ہو رہی ہے۔

گذشتہ نصف صدی سے دنیا کی آبادی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ یہ اضافہ ترقی پذیر ممالک میں بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے بہت سے سماجی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ کثرتِ آبادی کی ایک اہم وجہ خاندانی منصوبہ بندی کے اصولوں سے جان کاری و واقفیت کا نہ ہونا ہے۔ پسماندہ ممالک میں وسائل کی کمی کی بنا پر شرح پیدائش کو کم کرنا بہت ضروری ہے تاکہ لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہو سکے۔

معاشرے میں مسائل و جرائم کے اسباب میں کچھ حصہ عدم برداشت کا بھی ہے۔ جب کسی شخص کے مزاج اور طبیعت کے خلاف کوئی کام ہو جائے اور کسی سے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو وہ قوتِ برداشت کی کامیابی کی وجہ سے اس کا انتقام لینے کے درپے ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ہمیں تحمل اور برداشت سے کام لینا چاہیے کیونکہ تحمل کی تعریف ہی یہی ہے کہ کسی ناگوار بات کو انتقام کی قدرت رکھتے ہوئے بھی برداشت کیا جائے اور کسی طرح کا بغض اپنے دل میں نہ رکھا جائے کیونکہ اسلام ہمیں ایسے مواقع پر بردباری اور برداشت کا درس دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"وہ لوگ جو اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں اور لوگوں کا قصور معاف کر دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

جرائم کے اسباب میں ایک ظاہری سبب قانونی گرفت کا فقدان بھی ہے۔ قانون جتنا سخت اور غیر لچک دار ہو، لوگ جرم سے اتنا زیادہ بچیں گے۔ اگر قانون نرم اور لچک دار ہو تو مجرم جرم کے ارتکاب سے نہیں گھبرائے گا۔ مملکت خداداد میں مختلف وجوہات کی بنا پر قانون کی گرفت ڈھیلی اور غیر مؤثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تقریباً ہر فرد کی طبیعت میں بدمعاشی، قانون شکنی اور خود انتظامی کا تصور پایا جاتا ہے۔ لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات موجود ہے کہ حکومت وعدالت کے پاس انصاف نہیں جس کی وجہ سے جرائم کی شرح بڑھ گئی ہے۔ حکومت کو قانون نافذ کرنے والے اداروں کے افراد کی جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ ذہنی تربیت کا انتظام کرنا چاہیے تاکہ ان کی مینٹل اپروچ بہتر ہو سکے اور وہ اس جدید دور میں جرائم کے جدید طریقوں سے بہتر طور پر نپٹ سکیں۔

اتحاد و یکجہتی کی کامیابی بھی معاشرے میں جرائم کی پیداوار کا سبب ہے۔ حالات کچھ اس نہج پر آگئے ہیں کہ ہر فرد ذاتی مفادات کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ ایک دوسرے کی خبر گیری نہیں، ہر شخص خود غرضی اور خود فریبی کے جنون میں مبتلا ہے۔ باہمی اعتماد کی کمی اور نظریاتی انتشار جرائم پیشہ عناصر کو جرائم کے لیے ماحول ساز گار کر دیا ہے حالانکہ اسلام ہمیں باہمی اتحاد و اتفاق کی تلقین کرتا ہے اور ایک دوسرے کی ایذا رسانی سے منع کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"ایک دوسرے کی مدد نیکی اور تقویٰ میں کرتے رہو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔"

اسلام کے نزدیک لڑائی جھگڑا کرنے والے لوگ فساد کی جڑ ہوتے ہیں اور انہیں کوئی بھی (خواہ اس کا تعلق کسی بھی معاشرے سے ہو) تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔

ہمارے معاشرے میں کچھ لوگ خود تو جرائم سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں مگر جو لوگ مجرمانہ زندگی کی خطرناک لہروں میں پھنسے ہوئے ہیں، ان کو اس برائی کے بھنور سے نکالنے اور بچانے کی فکر نہیں کرتے، یہ ایسی اجتماعی غلطی ہے جو عام ذہنوں میں رچ بس گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جرائم خواہ قتل و غارت، ڈکیتی اور اغوا کی صورت میں ہو یا لسانی فسادات اور مختلف قسم کی دہشت گردی کی صورت میں ہو، روز بروز بڑھ رہے ہیں لیکن ان کے سدباب کا اہتمام نہیں۔ جرم لوگوں کے سامنے ہوتا ہے لیکن وہ اس کی روک تھام کے لیے ردعمل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

آج ہمارا معاشرہ جن لاینحل مسائل و مصائب کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے اس کی ایک بڑی وجہ خوفِ خدا سے غفلت اور فکرِ آخرت کو ترک کرنا ہے۔ ہم نے اس ناپائیدار دنیا کو مقصود و مطلوب بنایا ہوا ہے اور آخرت کی دائمی اور نہ ختم ہونے والی زندگی کا بھلا دیا ہے۔ انہی اجتماعی گناہوں، غفلتوں اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہے کہ آج پورا معاشرہ جرائم کی لپیٹ میں ہے اور نت نئے مسائل کا سامنا کر رہا ہے۔ اگر آج بھی لوگوں کے دل و دماغ میں یہ حقیقت راسخ کر دی جائے زندگی صرف اس دنیا تک محدود نہیں بلکہ مرنے کے بعد ایک نہ ختم ہونے والی زندگی ہو گی جس میں لوگوں کے حقیقی معنوں میں کامیابی اور ناکامی کا اعلان کیا

جائے گا تو صرف ایک چیز ہے جو انسانوں کو تنہائی میں مجرمانہ سرگرمیوں سے باز رکھنے پر مجبور رکھ سکتی ہے۔ یقیناً ایمان اور عملِ صالح اس دنیا کو امن و امان کو گہوارہ بناتے ہیں۔ انفرادی طور پر ایک انسان کی نیکی و پارسائی اور مجموعی طور پر پورے معاشرے میں نیکی و پرہیز گاری، صلاح و تقویٰ کی پاسداری بہتر اور پر امن معاشرے کی ضمانت ہے۔

ایمان اور عملِ صالحہ سے قلب و روح کی دنیا بہار آفریں بن جاتی ہے اور جب ایسے انسان کسی معاشرے میں بکثرت ہوتے ہیں تو ماحول میں عبادات و ریاضات اور احکام الٰہیہ کی پابندی کا نور جگمگانے لگتا ہے، عدل و انصاف، رواداری، پیار و محبت، امانت و دیانت، اخلاص و رضا جوئی کے انوار بکھرنے لگتے ہیں اور ان کے عملِ صالح کی خوش رنگی ایمانی کیفیات کو نور و سرور بخشتی ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرہ سکینت و طمانیت، راحت و رحمت کا مظہر بنتا ہے۔ اس کے برعکس کفر و شرک کی تاریکی اور اعمال کی گندگی بھی ایک ایسی بدنما حقیقت ہے جو اپنے اندر حد درجہ عفونت رکھتی ہے جس کے تعفن کا ایمان و اعمال صالح پر کاربند نیک افراد تحمل نہیں کر سکتے۔

ایک مثبت خوشگوار معاشرے کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ اوپر بیان کی گئی تمام برائیوں اور تمام مسائل کو نہ صرف تسلیم کیا جائے بلکہ ان کی وجوہات اور ان کے شدید اور تیز رفتار پھیلاؤ کی پسِ پردہ وجہ کو سمجھا جائے، پھر ان کی روک تھام اور ان سے بچاؤ کے لیے مختلف تدابیر کی جائیں کیونکہ:

؎ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ضرورت ایک اسلامی معاشرے کی اقدار اپنانے کا ہے کیونکہ اسلامی معاشرہ انسان کی روحانی تربیت بھی کرتا ہے اور افراد کو محبت و شفقت، اتحاد و تعاون، اخوت، خدمتِ خلق، فرمانبرداری، ایثار و قربانی جیسی صفات کو اپنانے اور حسد، تفرت، خود غرضی، تعصب وغیرہ جیسی برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ معاشرے سے جرائم کے رجحانات میں کمی کے لیے ہمیں سب سے پہلے لوگوں کے دل و دماغ میں خوفِ خدا اور فکرِ آخرت پیدا کرنا ہوگی۔ اس سلسلہ میں آئمہ کرام پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مساجد میں منبر و محراب پر بیٹھ کر بچوں اور نوجوانوں کے ذہنوں تک اسلام کے زریں اصول پہنچائیں اور مختلف جرائم کے نقصانات سے مذہبی اصولوں کی روشنی میں لوگوں کو آگاہ کرتے رہیں۔

جب تک معاشرے میں عملی طور پر برائی کے خلاف سخت رد عمل نہیں ہوگا، اس وقت تک جرائم کی جڑیں مضبوط رہیں گی۔ معاشرے میں اعلیٰ اقدار اور اچھے اخلاق کے ذریعے منفی اور غیر ذمہ دارانہ رویوں کی حوصلہ شکنی کی جاسکتی ہے۔ بقول شاعر:

؎ جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زبان سے نہیں لگتی کچھ اس میں محنت زیادہ

تہذیب و تمدن کی تبدیلی و ترقی کی وجہ سے مجرمانہ سرگرمیوں کی تکنیک میں جو ترقی ہوئی اور عادی جرائم پیشہ افراد ارتکابِ جرم کے جو نت نئے طریقے اپنا رہے ہیں، ان تبدیلیوں کے اسباب پر غور کرنا ضروری ہے۔ اگر معاشرے سے مجرمانہ سرگرمیوں کا خاتمہ کرنا ہے تو سب سے پہلے مجرمانہ سرگرمیوں کے محرکات معاشرے میں تلاش کر کے ان کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے اور حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی رعایا اور ماتحت کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔ ایک تعلیمی ماحول پیدا کرے تاکہ ہر شہری تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو سکے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"کہہ دیجیے کہ علم والے اور بے علم والے کہیں برابر ہوتے ہیں۔"

مجرمانہ ذہنیت کے خاتمے اور جرائم کی بیخ کنی کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کا ہر فرد تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو۔ اس کے لیے تعلیمی ادارے قائم ہونے چاہیے اور بالخصوص پرائمری سطح پر تعلیم کو خصوصی توجہ دی جائے۔

ملک سے بے روزگاری کو دور کیا جائے اور صنعتوں کو فروغ دیا جائے۔ تدارک جرائم اور معاشرہ سے بدامنی کو دور کرنے میں سزا کی ضرورت مسلّم ہے۔ اربابِ حکومت جیلوں کے نظام پر توجہ دیں، جیلوں کے اندر اسلامی اور اخلاقی تعلیم کا معقول بندوبست کیا جائے، عام جرائم کے مرتکب قیدی کو عادی سنگین جرائم کے قیدیوں سے الگ رکھا جائے تاکہ وہ ان کے اثرات سے محفوظ رہے۔

الغرض اسلام کا معاشی نظام اور معاشرتی نظام پوری دنیا کی قوموں کے لیے ایک دعوتِ عمل ہوگا۔ لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کا اعتراف کرے اور اس کی تعلیمات سے استفادہ کر کے اپنی زندگی کو پر سکون اور خوشحال بنائے وگرنہ انسانی ذہن کے اختراع کردہ قوانین اور نفس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کی جانے والی بداعمالیوں کے نتائج وہ خود بھگت رہا ہے۔ اگر انسان خود کو ہی ہمہ دان سمجھتا رہا تو تباہی و بربادی اس کا مقدر بن جائیگی اور پھر کوئی بھی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔

* * * * *